اسلام
اور عصرِ جدید

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملّیہ اسلامیہ۔ ۲۵

اسلام اور عصرِ جدید

مدیر

اقتدار محمد خاں

نائب مدیر

محمد سعید انور

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵

اسلام اور عصرِ جدید (سہ ماہی)

(جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر)

جلد نمبر: ۵۶ جنوری ۲۰۲۴ء شمارہ: ۱

ISSN 2278-2109

اعانت زر کی شرحیں

	فی شمارہ	سالانہ	
اندرون ملک	100/روپے	380/روپے	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
پاکستان و بنگلہ دیش	4/امریکی ڈالر	15/امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
دیگر ممالک	12/امریکی ڈالر	40/امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے)

حیاتی رکنیت

اندرون ملک	5000/روپے
پاکستان و بنگلہ دیش	150/امریکی ڈالر
دیگر ممالک	400/امریکی ڈالر

اس شمارے کی قیمت 100/روپے

پرنٹنگ اسسٹنٹ: راشد احمد **ٹائٹل:** ارتج گرافکس

© جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ
مقالہ نگاروں کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

پتہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

Website: www.jmi.ac.in/zhiis E-mail:zhis@jmi.ac.in

طابع وناشر: **پروفیسر اقتدار محمد خاں** اعزازی ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۲۵

مطبوعہ : لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

بانی مدیر

ڈاکٹر سید عابد حسین (مرحوم)

مجلسِ ادارت

پروفیسر اقبال حسین (صدر)

- پروفیسر طلعت احمد
- نجیب جنگ آئی۔اے۔ایس (ریٹائرڈ)
- سید شاہد مہدی آئی اے ایس (ریٹائرڈ)
- لیفٹیننٹ جنرل محمد احمد ذکی (ریٹائرڈ)
- پروفیسر اختر الواسع
- پروفیسر محمود الحق
- پروفیسر سلیمان صدیقی

فہرست

- حرف آغاز — اقتدار محمد خاں — ۷
- فکرِ اسلامی کی عصری ترجمانی — عبید اللہ فہد — ۱۵
- ترجمۂ مثنوی معنوی
  قاضی سجاد حسین — تنقیدی مطالعہ — مغیث احمد — ۶۷
- تحریک ریشمی رومال میں
  شاہ عبدالرحیم رائے پوری کا کردار — محمد بدر عالم ندوی — ۱۰۱

- ہندوستانی مسلم خواتین اور خدمت خلق: ایک جائزہ — محمد تحسین زماں/ ندیم سحر عنبرین — ۱۱۳
- اسلامی اور مسیحی تصورِ محبت کا فرق — محمد علی — ۱۲۳
- تعارف وتبصرہ — محمد مشتاق تجاروی — ۱۴۱

حرف آغاز

اُم المومنین اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نام رملہ، کنیت ام حبیبہ، والد کا نام صخر بن حرب ابوسفیان اور والدہ کا نام صفیہ بنت ابو العاص تھا۔ آپ کی پیدائش بعثت نبوی سے تقریباً سترہ سال پہلے ہوئی۔ سلسلہ نسب حسب ذیل ہے؛ رملہ بنت ابوسفیان بن حرب بن امیہ بن عبدشمس بن عبدمناف۔ والدہ کی طرف سے سلسلہ نسب کچھ یوں ہے: رملہ بنت ام صفیہ بنت ابی العاص بن امیہ بن عبدشمس بن عبدمناف۔ والد اور والدہ دونوں کی طرف سے پانچویں پشت میں جا کر آپ کا سلسلہ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب سے مل جاتا ہے۔ آپ کی کنیت ''ام حبیبہ'' ہے۔ پہلے شوہر عبیداللہ بن جحش سے ایک لڑکی حبیبہ پیدا ہوئی، اس وجہ سے آپ کی کنیت ام حبیبہ ہے۔

آپ رضی اللہ عنہا خاندان بنوامیہ کی چشم و چراغ تھیں۔ اُمیہ قریش کا ایک سردار تھا جس کی اولاد کو ''بنوامیہ'' کہا جاتا ہے۔ قریش کا

ہی ایک دوسرا بڑا خاندان ''بنو ہاشم'' بھی تھا جس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق تھا۔ ان دونوں میں خاندانی رقابت اور چشمک چلی آتی تھی یہی وجہ تھی کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ نبوت فرمایا تو آپ کی مخالفت میں بنو امیہ پیش پیش رہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہمارے حریف بنو ہاشم کو یہ اعزاز نصیب ہو۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ عہدِ رسالت میں اسلام کے خلاف جو بھی جنگیں ہوئیں ان میں اسی خاندان بنو امیہ کے افراد نے قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔ بدر میں جب اس خاندان کے سردار عتبہ، ولید اور حنظلہ کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تو اپنے ان سرداروں کا انتقام لینے کے لیے ابوسفیان نے مسلمان ہونے تک کئی حربے آزمائے۔ بالآخر فتح مکہ کے موقع پر اس خاندان کے اکثر افراد نے اسلام قبول کرلیا۔

اس خاندان میں باصلاحیت لوگوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ لوگ بہادر، جانباز اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ پڑھے لکھے بھی تھے، اس لیے ان کو سیاسی وفوجی ذمہ داریاں سونپیں گئیں۔ فتح مکہ کے موقع پر ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے گھر کو دارالامن قرار دیا گیا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو کتابتِ وحی کی عظیم سعادت سے بہرہ ور فرمایا گیا اور اسی خاندان کے چشم وچراغ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ خلافت کے اعلیٰ منصب پر فائز ہوئے۔ اس کے علاوہ آپ رضی اللہ عنہا کے خاندان کا خاندانِ نبوت بنو ہاشم سے بہت گہرا تعلق ہے۔ سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے بھائی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زُلف تھے۔ آپ کی بہن قریبہ صغریٰ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں۔ قبل از اسلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بڑی صاحبزادی

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح لقیط بن الربیع جن کی کنیت ابو العاص تھی، سے کیا جو اسی خاندان بنوامیہ کے ایک فرد تھے۔اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو صاحبزادیاں یکے بعد دیگرے سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا اور سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح اسی خاندان بنوامیہ کے چشم و چراغ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی والدہ صفیہ بنت ابوالعاص حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے والد عفان بن ابوالعاص کی سگی بہن اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پھوپھی تھیں۔اس لحاظ سے آپ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔

آپ کی پہلی شادی عبیداللہ بن جحش سے ہوئی تھی۔وہ زینب بنت جحش کے بھائی تھے جن سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح کیا تھا۔آپ اپنے شوہر عبیداللہ کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ (ایتھوپیا) چلی گئی تھیں۔شوہر اسلام سے مرتد ہو کر عیسائی ہو گئے اور انہوں نے آپ کو بھی مرتد ہونے کو کہا لیکن آپ نے انکار کر دیا،اسی وجہ سے ان میں علیحدگی ہوگئی۔اس کے بعد اپنے سابقہ شوہر کی وفات تک وہ اپنی بیٹی حبیبہ کے ساتھ حبشہ میں ہی رہیں۔جب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان حالات کا پتہ چلا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجاشی کو لکھا کہ وہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پیام دے۔ام حبیبہ نے منظوری دے دی تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے خالد بن سعید بن العاص نے ایجاب وقبول کیا اور نجاشی نے خود چار ہزار درہم مہر ادا کیا۔اس طرح ۶ھ (۶۲۷ء) میں آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے نکاح میں آ گئیں اور مدینہ تشریف لے آئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے نکاح کا واقعہ بیان

کرتے ہوئے حضرت ام حبیبہ فرماتی ہیں کہ جب میرے شوہر عبیداللہ بن جحش کا انتقال ہوا تو میں نے خواب دیکھا کہ کوئی مجھے کہہ رہا ہے۔ اے ام المومنین! میں خواب میں ہی چونک گئی، پھر اس خواب کی تعبیر میں نے یہ سمجھا کہ ان شاء اللہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت نصیب ہوگی۔ اس کے بعد جب میری عدت مکمل ہوئی تو شاہ حبشہ نجاشی کا ایک قاصد میرے گھر آیا۔ وہ ایک باندی تھی جس کا نام (ابرہہ) تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ بادشاہ سلامت نے تمہارے لیے پیغام بھجوایا ہے۔ بادشاہ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب آیا ہے کہ وہ تمہارا نکاح رسول اللہؐ سے کر دیں۔ یہ سنتے ہی حضرت ام حبیبہ نے پیغام لانے والی باندی کو دعا دی اور اسی خوشی میں اپنے کنگن، پازیب اور انگوٹھی اتار کر اسے انعام کی صورت میں دے دی۔ بادشاہ کے پیغام کے مطابق انہوں نے اپنے رشتہ دار خالد بن سعید کو اپنا وکیل مقرر کیا۔ شام کو نجاشی نے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ سمیت حبشہ میں موجود تمام مسلمانوں کو بلوایا اور ان کی موجودگی میں توحید و رسالت کے اقرار پر مشتمل خطبہ پڑھا اور کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام بھیجا ہے کہ میں ام حبیبہ بنت ابی سفیان کے ساتھ ان کا نکاح کرادوں تو میں نے ان کے حکم کے مطابق یہ نکاح کر دیا ہے۔

آپؓ کے وکیل نے بھی خطبہ پڑھ کر اعلان کیا کہ میں نے ان کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا ہے، اللہ تعالیٰ اس نکاح میں برکت عطا فرمائے۔ اس کے بعد نجاشی نے کہا کہ انبیاء کرام کی یہ سنت ہے کہ ان کے نکاح کے بعد ولیمہ کا کھانا کھلایا جاتا ہے، سب کے لیے کھانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ یوں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح اور ولیمہ نجاشی نے کیا۔ نکاح سے اگلے دن نجاشی نے

حضرت ام حبیبہؓ کو مختلف قسم کے عطریات اور جہیز کا سامان دے کر عزت واحترام کے ساتھ حضرت شرحبیل بن حسنہؓ کے ہمراہ مدینہ طیبہ روانہ کیا۔ سردار قریش ابوسفیان کو جب اس نکاح کی خبر پہنچی تو اسے بہت مایوسی ہوئی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہنے لگا کہ وہ جواں مرد ہیں، ان کی ناک نہیں کاٹی جاسکتی۔ یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اونچی شان واعلیٰ عزت کے مالک ہیں، ہم ان سے دشمنی کر کے ان کا نام نہیں مٹا سکتے۔ گویا اس نے دل ہی دل میں اپنی شکست تسلیم کر لی۔

ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بہت پاکیزہ ذات، حمیدہ صفات کی جامع اور نہایت ہی بلند ہمت اور سخی طبیعت کی مالک تھیں، سخاوت وشجاعت، دین داری اور امانت ودیانت کے ساتھ بہت ہی قوی الایمان تھیں۔ سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کے نکاح میں آنے کے بعد آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتی تھیں۔ فتح مکہ سے قبل ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے والد ابوسفیان جو ابھی ایمان سے مشرف نہ ہوئے تھے صلح حدیبیہ کی تجدید کے لیے مدینہ منورہ آئے تو انہوں نے سب سے پہلے اپنی بیٹی کے گھر جانے کا قصد کیا۔ چنانچہ ابوسفیان اُم حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہ حجرہ اقدس میں آئے۔ وہاں سرکارِ دوعالمؐ کا بستر لگا ہوا تھا، ابوسفیان اس بستر پر بیٹھنا چاہتے تھے تو ان ہی کی بیٹی سیدہ ام حبیبہ نے اپنے باپ کی ذرہ بھی پرواہ نہیں کی اور جلدی سے بستر کو کھینچ کر کہا کہ یہ بستر نبوت ہے، میں کبھی یہ گوارا نہیں کرسکتی کہ ایک مشرک اس پاک بستر پر بیٹھے۔ ابوسفیان باپ ہوکر حیران وپریشان ہوگیا کہ عرب کا مہمان نواز معاشرہ جس میں مہمان کے لیے

جانیں تک قربان کردی جاتی ہیں، ایسے معاشرے میں بیٹی اپنے باپ کے ساتھ ایسی انہونی حرکت کیسے کرنے لگی؟ ابوسفیان نے وجہ پوچھی تو آپؓ نے جواب میں فرمایا کہ بے شک آپ میرے والد ماجد ہونے کے ناطے قابل احترام ہیں، لیکن یہ بستر کوئی عام بستر نہیں، بلکہ اس پاک ہستی کا ہے جس کے صدقے زمین کو بھی پاکی نصیب ہوئی ہے۔ اے اباجان! آپ نے اسلام قبول نہیں کیا ہے اس لیے آپ ایک مشرک انسان ہیں۔ میں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کے بستر کو آپ کے بیٹھنے کی وجہ سے خراب نہیں کرسکتی اس لیے آپ کو زمین پر ہی بیٹھنا ہوگا۔

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عبادت گزار خاتون تھیں، ہر وقت ذکر الٰہی میں مشغول رہتیں۔ فرائض وواجبات کی ادائیگی کے تو کیا کہنے، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نفلی عبادات بھی بہت زیادہ کرتیں۔ ایک بار آپ صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص بارہ رکعات نفل روزانہ پڑھے گا اس کے لیے جنت میں گھر بنایا جائے گا۔ جب آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یہ سنا تو اس وقت سے لے کر آخر عمر تک کبھی بھی ان کا ناغہ نہیں کیا۔ ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا جو مسلمان ہر روز اللہ تعالیٰ (کی رضا) کے لیے بارہ رکعات نفل پڑھے گا اس کے لیے ان کے بدلہ میں جنت میں گھر بنایا جائے گا۔ آپؓ فرماتی ہیں میں نے اس دن کے بعد کبھی بھی یہ بارہ رکعات ترک نہیں کیں۔''

آپؓ سخی اور عالی ہمت تھیں۔ عہد عثمانی میں جب خوارج نے حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کرلیا اور ضرورت کی کوئی چیز ان کے گھر میں جانے نہ دی تو اس وقت آپؓ مضطرب و بے چین ہوگئیں۔ ہر

طرح کے خطرات کو پس پشت ڈال کر پانی کا ایک مشکیزہ اور کچھ کھانا لے کر اپنے خچر پر سوار ہوئیں اور حضرت عثمانؓ کے گھر کی طرف روانہ ہوگئیں مگر فسادیوں نے انہیں روک کر ان کے خچر کو زخمی کر دیا۔ پھر کچھ لوگوں نے انھیں گھر واپس پہنچایا۔ پہلی شادی کے فوراً بعد ہی دونوں میاں بیوی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ بڑی سختی سے وہ اپنے دین پر کار بند رہیں تھیں اور شوہر کے مرتد ہوجانے کے بعد بھی دین کو نہیں چھوڑا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آنے کے بعد ان کا اخلاق کمال تک پہنچ گیا تھا۔ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑی شدت سے عمل کرتی تھیں اور دوسروں کو بھی احادیث پر عمل کرنے کی تلقین کرتی تھیں۔ سیدہ ام حبیبہؓ ایک عظیم خاتون تھیں۔ وہ اپنے والد اور باقی اہل خانہ کے قبول اسلام کے لیے بہت دعائیں مانگا کرتی تھیں، ان کی سب دعائیں فتح مکہ کے دن قبول ہوئیں اور ان کے والد نے اسلام قبول کر لیا۔ ام حبیبہؓ کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکاح اسلام کی بہتری اور توسیع تعلقات میں مددگار ثابت ہوا اور یہ بات بھی واضح ہوئی کہ نبی محض اللہ کا پیغام پہنچانے والا نہیں ہوتا بلکہ معاشرے میں رہنے والا جلیل القدر انسان بھی ہوتا ہے۔

اہلِ سیر کہتے ہیں کہ جب آپؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپؓ نے ام المومنین سیدہ عائش صدیقہ اور ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کہا کہ مجھے ان امور میں معاف کر دو جو ایک شوہر کی بیویوں کے درمیان ہوجاتے ہیں اور اس نوع سے جو کچھ میری جانب سے تمہارے متعلق واقع ہوا ہو اسے معاف کر دو۔ انھوں نے کہا کہ حق تعالیٰ آپ کو بخشے اور معاف کرے ہم بھی معاف کرتے ہیں۔ ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا اللہ تعالیٰ

تمہیں خوش رکھے تم نے مجھے خوش کر دیا۔

آپؓ کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے بہت محبت تھی اسی وجہ سے شوہر کے مرتد ہوجانے کے باوجود آپ اسلام پر ثابت قدم رہیں۔ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایک باوقار سردار مکہ کی لخت جگر تھیں، شہزادی تھیں، حسن و جمال میں اپنی مثال آپ تھیں۔سردار مکہ کی شہزادی ہوکر اپنے آرام وسکون، عزت واقتدار، شوکت وحشمت سمیت سب کچھ اسلام پر قربان کرڈالا۔ایمان کو مضبوطی سے تھامے رکھ کر تاریخ اسلام کا ایک لازوال کردار بن گئیں۔آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے صبر واستقلال کی ایک روشن مثال سے تاریخ کے ورق جگمگا اُٹھے ہیں۔آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی زندگی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کو دنیا میں جتنی بھی نعمتیں ملی ہیں ان میں سب سے مقدم اور قیمتی نعمت ایمان ہے کیونکہ جسے ایمان کی نعمت مل جائے گویا اُسے ساری کائنات کی نعمتیں مل گئیں۔دین حق کی سربلندی اور سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کی عزت وناموس کی خاطر اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیناہی ایک سچے مومن کی شان ہے۔کیونکہ دنیا کی نعمتیں، عزتیں اور جو کچھ بھی ہمیں ملا ہے وہ اسی خالق و مالک کا عطیہ ہے۔

اقتدار محمد خاں

عبیداللہ فہد *

فکرِ اسلامی کی عصری ترجمانی

تقویٰ پر عمل

۱۶؍نومبر ۲۰۲۲ء کو نئی دہلی میں پاکستانی سفارت خانہ میں اپنے صاحب زادے مثنیٰ فہد کے ساتھ شیروانی ٹوپی میں ملبوس وقت متعین پر ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو سبحانی میاں نے بتایا کہ ہائی کمشنر کسی ملاقاتی کے ساتھ ابھی مصروف ہیں۔ آدھا گھنٹہ مزید انتظار کے بعد جب ملاقات ہوئی تو حیرت واستعجاب سے میں اُن کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ علیک سلیک اور رسمی خیریت طلبی کے بعد اُن کا سوال بڑا دلچسپ تھا اور ناقابلِ یقین بھی:

> ''میں ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک ویڈیو کلپ دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ نظام باطل سے تعاون کرنا گناہ ہے۔ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ نہیں ہے۔ اِن حالات میں ہمارے جیسے بیوروکریٹ جو نظامِ ملکی کا حصہ ہیں، گناہ گار ہو جاتے ہیں۔''
>
> ''آپ اسلامک اسٹڈیز کے ماہر استاذ ہیں۔ تدریس وتحقیق کا طویل تجربہ

* پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ای میل: fahad.is@amu.ac.in

رکھتے ہیں۔ میں نے آپ کا مختصر تعارفی خاکہ دیکھا ہے۔ عالمِ اسلام کے مختلف خطوں کا آپ نے سفر کیا ہے۔ آپ بتائیے، ہمارے لیے کیا انتخاب باقی بچتا ہے؟ ہم یہ ملازمت چھوڑ دیں یا گناہ کا بوجھ اپنے سر پر اٹھائے پھریں؟''

یاللعجب! ہائی کمیشن کا اعلیٰ ترین افسر دینی مسائل کے تئیں اتنا حساس اور فکر مند ہے! یہاں حال یہ ہے کہ اسلامی تحریکات کی قدآور شخصیات اور دینی اداروں کے سربرآوردہ علماء وفضلاء بھی نظام باطل اور اس سے تعاون کے کلامیہ کو پسِ پشت ڈال چکے ہیں۔ دور دور تک اس کلامیہ سے دلچسپی رکھنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ حالات کے دباؤ میں، تکثیری معاشرہ کی الجھنوں میں، شراکت اقتدار اور جمہوریت کے سفسطوں میں اسلام پسند ایسے پھنسے کہ نظامِ باطل کا فلسفہ اب ایک واہمہ بن کر رہ گیا ہے۔

میں نے عرض کیا:

''اگر آپ کی نیت صادق ہے، جذبہ مخلص ہے تو فتویٰ نہیں، تقویٰ پر عمل کیجیے۔ اپنے ضمیر سے، نفس لوّامہ سے پوچھیئے، مسئلہ کا حل کیا ہے۔ میں نے ملیشیا میں انور ابراہیم کی گرفتاری اور نظر بندی کے حالات دیکھے ہیں۔ حکومت کے دفاتر میں اعلیٰ عہدوں پر کام کرنے والے افسران کے دل انور ابراہیم کے ساتھ دھڑک رہے تھے۔ اُن کے اہلِ خانہ اور نوجوان لڑکے لڑکیاں حکومت مخالف مظاہروں میں آگے آگے تھیں۔ انھوں نے حکومت کا دست وبازو بنتے ہوئے بھی حزب اختلاف کا ساتھ دیا۔ آپ خود سوچیں، ملکی اصلاحات میں کس طرح حصہ داری نبھا سکتے ہیں۔ میری رائے اور میرا علم اس سلسلے میں ناکافی ہے۔ اللہ نے آپ کو حساس اور اسلام پسند ذہن دیا ہے، استخارہ کیجیے۔ وہ ضرور رہنمائی کرے گا۔''

میں حاضر ہوا تھا پاکستان کی تین جامعات میں ہونے والے علمی مذاکروں میں شرکت کی خاطر ویزا حاصل کرنے کے لیے:

۱۔ شیخ زائد اسلامک سینٹر، پنجاب یونیورسٹی لاہور (۲۲ نومبر ۲۰۲۲ء)

۲۔ شعبہ حدیث وسیرت، دی اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور (۲۸ر نومبر ۲۰۲۲ء)

۳۔ شعبہ اسلامک اسٹڈیز، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان (۷، ۸ر دسمبر ۲۰۲۲ء)

دعوت نامہ تو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے پروفیسر محی الدین ہاشمی کی طرف سے بھی تھا مگر ہائی کمیشن کو اُس دعوت نامے کی زبان وبیان سے اختلاف ہوگیا اور میری طبع نازک پر بھی گراں گزرا۔

ویزا تو حاصل ہوا لخت جگر مثنیٰ فہد کی تگ ودو کی وجہ سے، مگر ملتان کے پیر مغان ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب نے بھی ٹھان لی تھی اِس بار ہر حال میں حاضری کی سعادت مجھے حاصل ہو جائے خواہ اس کے لیے انھیں ذاتی طور پر حلفیہ ضمانت ہی دینی پڑے۔ ملتان ہی کے لیے نہیں، لاہور اور بہاول پور کی جامعات میں منعقد ہونے والے سیمیناروں اور کارگاہوں کے لیے بھی انھوں نے ساری تدبیریں اختیار کیں۔ پاکستان میں ہمارے میزبان ویسے وہی تھے بقیہ میزبانوں کی حیثیت طفیلی تھی۔ گرچہ یہ طفیلی میزبان بھی قانونی داؤں پیچ سے بلند اور اعلیٰ درجہ کے مہمان نواز تھے اور ہر قدم پر مجھے احساس دلاتے رہے۔ اپنی بے تکلفی اور ضیافت کی پاسداری کی بدولت کہ وہی اصل میزبان ہیں اپنی جامعات میں اور اپنے شہروں میں بھی۔

کولمبو طیران گاہ پر

خدا خدا کر کے ۱۹ر نومبر کی رات میں ۱۰ر بجے دونوں بیٹوں کی رفاقت میں دہلی کے لیے روانہ ہوا۔ سراقہ فہد دہلی یونیورسٹی میں سوشل ورک میں ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔ انھیں طیران گاہ پر مجھے رخصت کر کے اپنی یونیورسٹی جانا تھا۔ ۲۰ر نومبر کی علی الصبح پانچ بج کر دس منٹ پر سری لنکن ایرلائنز UL-192 سے مجھے کولمبو کے لیے پرواز کرنا تھا اور وہاں سے اُسی دن گیارہ بج کر چالیس منٹ پر کولمبو کو الوداع کہہ کر تین بج کر پندرہ منٹ پر لاہور نازل ہونے کا پروگرام تھا۔ پرواز اُسی کمپنی کے طیارہ سے تھی البتہ نمبر UL-185 تھا۔

میں بندرانائیکے بین الاقوامی طیران گاہ کولمبو میں عبوری مسافر کے درجہ میں بیٹھا اگلے سفر کے لیے اعلان کا منتظر تھا کہ یاد آیا۔ طاہرہ فہد نے دستی بستے میں سیب اور سنترے رکھ دیے تھے اور خشک میوہ جات بھی۔ وہ رفیقِ حیات ہیں اور میری ضروریات سے مجھ سے زیادہ واقف بھی۔ لذت کام ودہن سے فراغت

ہوئی تو پیاس محسوس ہوئی۔ بیگ میں دوائیں بھی تھیں اور پانی کی بوتل بھی۔ آج سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی معنویت آشکارا ہو رہی تھی۔ ایک رفیقِ حیات کی ناگزیریت پر کتنی پیاری حدیث ہے:

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ صحابہ کے ایک گروہ نے ازواجِ مطہرات سے راز داری سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے بارے میں دریافت کیا۔ پھر اُن میں سے بعض نے کہا: میں شادی نہیں کروں گا۔ کسی نے کہا: میں گوشت نہیں کھاؤں گا اور کسی نے کہا: میں بستر پر استراحت نہیں کروں گا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ سب سن کر خطبہ دیا) اور حمد وثنا کی پھر فرمایا:

مَا بَالُ أقوَامٍ قَالُوْا كَذَا وَكَذَا لكنّي أصلّي وَأنامُ وَأصومُ وَ أفطرُ و أتزَوَّجُ النِّسَآءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنّيْ.

(صحيح مسلم، كتاب النكاح، حديث: رقم ۱۴۰۱؛ بخاری، كتاب النكاح، حديث رقم: ۵۰۶۳)

''اِن لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انھوں نے اس طرح کی باتیں کہیں۔ میرا معاملہ تو یہ ہے کہ نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ روزے رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ شادیاں بھی کرتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے بے رغبتی دکھائی اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔''

کولمبو کی طیران گاہ پر پانچ گھنٹے کیسے گزر گئے پتہ ہی نہیں چلا۔ انتظار گاہ میں گوجرانوالہ کے ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی جو عمران خاں کی اداؤں پر فریفتہ تھا۔ پہلی بار صاف ستھری شبیہ کے ایک عوامی رہنما نے سیاست کے خارزار میں قدم رکھا ہے۔ دیکھیں پیشہ ور سیاست داں اُسے کیسے برداشت کرتے ہیں۔ وہ اپنی تقریروں میں میثاق مدینہ کے حوالے فخر سے دیتا ہے۔ ملک کا سر افتخار سے بلند رکھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ امریکہ کی غلامی اُسے پسند نہیں ہے۔ وہ اپنے ملک کو خود کفیل اور خود مکتفی دیکھنے کا آرزومند ہے مگر کیا فاسق وفاجر حکمراں اُسے برداشت کر پائیں گے؟ گوجرانوالہ کے نوجوان کو تشویش تھی۔

شب و روز ڈائری کا اعجاز

علامہ اقبال بین الاقوامی طیران گاہ لاہور تقریباً چار بجے پہنچے۔ غیر ملکی مہمانوں کو رسمی قانونی

کارروائی میں کافی تاخیر ہوتی ہے مگر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا تعارفی کارڈ ہر جگہ آسانیاں پیدا کر دیتا ہے۔ طیران گاہ کے ایک نوجوان ملازم نے مجھے باادب ایک کمرے میں بیٹھنے کی پیش کش کی۔ اُس نے میرے ہاتھ میں ۲۰۲۲ء کی شب و روز ڈائری دیکھی تو اسے سخت تعجب ہوا:

''کیا ہندوستان میں اردو بولی جاتی ہے؟ کیا یونیورسٹیوں میں ابھی تک اردو زندہ ہے؟ آپ لوگ اپنے گھروں میں اردو بولتے ہیں یا ہندی؟ اردو اخبار وہاں سے نکلتا ہے؟''

اور جب میں نے جواب دیا تو اُسے اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ وہ کبھی میری باتیں سنتا اور کبھی میری ڈائری الٹ پلٹ کر دیکھتا۔ سرورق کے بعد ہی شفیق جون پوری کے شعر نے اُسے لوٹ لیا:

کشتی کا ذمہ دار فقط ناخدا نہیں
کشتی میں بیٹھنے کا سلیقہ بھی چاہیئے

اور پھر وہ ورق گردانی کرنے لگا۔ شب و روز - جماعتِ اسلامی ہند، فہرست تعطیلات ۲۰۲۲ء، خطبۂ جمعہ اولیٰ، خطبۂ ثانیہ، خطبۂ نکاح اور عقیقہ، نماز جنازہ، دعائے استخارہ، اوقاتِ نماز برائے دہلی۔ وہ ڈائری کے ایک ایک صفحہ کا عنوان پڑھتا گیا۔ حیرت اور مسرت سے ہر عنوان پر انگلی پھیرتا جیسے اُسے ناقابلِ یقین لگ رہا ہو۔ میں نے اپنا تعارفی کارڈ دکھایا تو فی البدیہ لپٹ گیا۔ زور سے نعرہ لگایا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی زندہ باد۔ اور آس پاس کام کرنے والے سارے ملازمین جمع ہو گئے۔ میں نے عرض کیا:

''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا شعبۂ اردو ہندوستان کی پیشانی کا جھومر ہے۔ ہندو پاک کے بیشتر ادیب اُسی کے فیض یافتہ ہیں۔ اُس کی تدریس و تحقیق کا معیار آج بھی معتبر و مستند ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے میری ۹۲ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں پانچ درجن سے زیادہ اردو میں ہیں۔''

تعظیم سنت یا تشہیر

یادگار کے طور پر نوجوان ملازم نے عقیدت سے کسی کتاب کی فرمائش کی اور مجھے معذرت کرنا پڑی۔ البتہ میں نے اُسے بتایا کہ میری بعض کتابیں پاکستان سے بھی شائع ہو چکی ہیں۔ فرطِ عقیدت میں

اُس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھایا کہ میں کچھ کتابوں کے نام لکھ کے اُس پر دستخط کر دوں اور میں نے دو چار کتابوں کے نام تحریر کر دیے:

(۱) تاریخ دعوت و جہاد، برصغیر کے تناظر میں [ادارہ معارف اسلامی لاہور] (۲) سید قطب شہید [منشورات لاہور] (۳) یہودی مغرب اور مسلمان [کتاب محل لاہور] (۴) جدید ترکی میں اسلامی بیداری - علامہ سعید نورسی سے پروفیسر نجم الدین اربکان تک [اسلامک پبلی کیشنز لاہور]

ایک دوسرے بزرگ ملازم نے مجھے متنبہ کیا بڑے پیار سے:

''آپ کے میزبان باہر منتظر ہیں۔ لاؤڈ اسپیکر سے آپ کے نام کا اعلان ہو رہا ہے۔ آپ ٹھہریے۔ میں میزبانوں کو آپ کی آمد کی اطلاع دے دیتا ہوں تاکہ وہ پریشان نہ ہوں۔ اِس دوران آپ چائے پئیں اور ہمارے اِن دوستوں کو آٹو گراف بھی دے دیں۔ میں نے سعودی عرب میں ہندوستانی مسلمانوں کو فصیح اردو بولتے ہوئے سنا ہے۔''

لیجیے، قہر درویش بر جانِ درویش۔ مجھے اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی کبھی نہیں رہی۔ یہ محض اللہ کا کرم ہے کہ ہر جگہ محبت و عقیدت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہ ملازم خود تعلیم یافتہ ہوں گے اور انھیں اچھی تربیت ملی ہوگی ورنہ کون کسی کا پُرسانِ حال ہوتا ہے۔

غربت میں کوئی چاہنے والا نہیں ہوتا
شمعیں بھی جلاؤ تو اجالا نہیں ہوتا

طیران گاہ سے باہر نکلے تو خلقِ خدا کا اژدہام تھا۔ ہاتھوں میں پھولوں کے ہار اور لبوں پر مسکراہٹ سجائے مہمانِ خاص کے منتظر تھے۔ سنتِ عمرہ کی ادائیگی اب زیب و زینت کی تقریب بن گئی ہے۔ رسمیات کے بوجھ تلے یہ تقدس اشتہار کا عنوان بن چکا ہے۔ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی قربانی اور طواف کعبہ کے آداب اب سامانِ تقریب و تشہیر میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ اژدہام کو چیرتا ہوا باہر نکلا تو حافظ عبدالوحید روپڑی اپنے پشاوری تاجر دوست نیازی خاں کے ساتھ استقبال کے لیے موجود تھے۔ مصافحہ و معانقہ ہوا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی حافظ روپڑی نے بڑی معصومیت سے عرض کیا:

''آج البیان اسلامک سنٹر میں حسبِ پروگرام میرا بیان ہوگا نماز مغرب

سے متصل۔لوگ جمع ہوں گے۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ آپ کے استقبال کے لیے ڈرائیور کو طیران گاہ بھیجوں۔اب وقت بہت کم رہ گیا ہے آپ اجازت دیں تو ہم براہِ راست وہیں چلیں۔ چائے وہیں پئیں گے۔ آپ کی آمد سے وہ لوگ بہت خوش ہوں گے۔اگر آپ کی طبیعت سازگار رہی تو درسِ قرآن آپ ہی دیں گے۔ منتظمین نہال ہوجائیں گے۔''

دہلی سے کولمبو کے راستے لاہور کا سفر تقریباً گیارہ گھنٹوں کا ہے اور علی گڑھ سے دہلی کی مسافت جمع کریں تو پندرہ گھنٹے ہوجاتے ہیں۔مسافر کے اعضاء وجوارح جواب دے جاتے ہیں اور دل ودماغ ماؤف۔مگر قرآن کے پیغام کی ترسیل کا مسئلہ ہو اور حبیب دل نواز حافظ عبدالوحید روپڑی جیسے میزبان کا معصومانہ حکم ہو تو وہی مسافر قربان ہوجاتا ہے۔ بڑی رغبت سے، پوری آمادگی کے ساتھ حافظ روپڑی کا ادنیٰ اشارہ ویسے بھی قاتل ہوتا ہے اور آدمی قتل ہونے کے بعد اپنے کو خوش قسمت تصور کرتا ہے۔ مصحفی نے صحیح کہا ہے:

اُس کے کوچے میں ہے ہر صورتِ بے دادنئی
قتل ہر خستہ بہ اندازِ دگر ہوتا ہے

ریشم وفولاد کا اجتماع

نمازِ مغرب کے معاً بعد حافظ عبدالوحید روپڑی نے مائیک سنبھالا۔حمد وثنا کے بعد گویا ہوئے:

''آج ہمارے درمیان ہندوپاک کے ایک بڑے اسکالر فروکش ہیں۔ان کی اسلام سے محبت دیکھیے۔ یہ ایئرپورٹ سے براہِ راست یہاں تشریف لائے ہیں۔آپ کے درمیان بیٹھ کر چائے پئیں گے۔آج خطاب اصلاً آپ ہی کا ہے۔آپ خوش قسمت ہیں کہ عصری درس گاہیں لاکھوں روپے خرچ کر کے انھیں دعوت دیتی ہیں اور آپ لوگ مفت میں اِن سے فیض یاب ہورہے ہیں۔''

میں نے قرآن مجید کی درج ذیل آیت کو مرکزِ گفتگو قرار دیا:

مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاء عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاء بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعاً سُجَّداً يَبْتَغُونَ فَضْلاً مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَاناً سِيْمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيْلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَى عَلَى سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْراً عَظِيْماً. (الفتح :۲۹)

''محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ اِن کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انھیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اُس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ہے اُن کی صفت تورات میں اور انجیل میں اُن کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی، پھر اُس کو تقویت دی، پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار اُن کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔ اِس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں اللہ نے اُن سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔''

میں نے عرض کیا۔ اقبال نے اِس آیت کی ترجمانی اپنے خاص انداز میں کی ہے:

گزر جا بن کے سیلِ تندرو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
مصافِ زندگی میں صورتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

حافظ روپڑی نے درج ذیل آیات کا خلاصہ پیش کیا:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّاراً. يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَاراً. وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَل لَّكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَل لَّكُمْ أَنْهَاراً. (سورہ نوح:۱۲-۱۰)

''میں نے کہا، اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، تمہیں مال اور اولاد سے نوازے گا، تمہارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کر دے گا۔''

آیات کا یہ ترجمہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا ہے۔ اس ترجمے میں دنیاوی انعامات کی رعایت کی گئی ہے۔ حافظ عبدالوحید روپڑی نے اپنے بیان میں دنیا و آخرت دونوں کے اجر کو سمو دیا۔ کہنے لگے۔ اللہ نے تم سے بس ایک عمل کا مطالبہ کیا ہے: استغفار یعنی اپنے گناہوں سے معافی کی درخواست۔ اس کے بدلے میں اللہ نے پانچ انعامات کا وعدہ کیا: (۱) گناہوں کی بخشش (۲) آسمان سے بارش کا نزول (۳) مال و دولت میں اضافہ (۴) اولاد میں افزائش (۵) جنت کے باغات اور نہریں۔

اسلوبِ بیان بالکل سادہ۔ اندازِ تخاطب عوامی مگر موثر، سیدھا دل میں اُتر جانے والا۔ حفیظ میرٹھی نے کتنی خوبصورت ترجمانی کی ہے:

اثر ہوا تو یہ تقریر کا کمال نہ تھا
میرا خلوص مخاطب تھا، میں کہاں بولا

ابھی گفتگو مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک صاحبِ علم منظور احمد بندیشہ نے عجیب سا سوال کر دیا، وہی سوال جو ہر محبِّ وطن پاکستانی ہندوستانی مسلمان سے کرتا ہے:

''سر، آپ اردو پڑھ لیتے ہیں؟''

اور جواب اثبات میں پا کر اپنی ایک کتاب میرے حوالہ کی بطور تحفہ۔ عنوان تھا ''دین اور اسلامائزیشن''۔ کتابچے میں زور اس بات پر تھا کہ ایک دو اقدامات سے اسلامائزیشن کا عمل مکمل نہیں ہو پاتا۔ ''اسلامی نظامِ زندگی کا نفاذ اصل ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں عوام کی تربیت اور قیامِ دین کی سرپرستی'' ناگزیر ہے۔

بیس سال میں پی ایچ ڈی

ڈین کلیہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور پروفیسر محمد حماد لکھوی سے ملاقات کی خاطر ۲۱ر نومبر کی صبح اُن کے دفتر حاضر ہوئے۔ حافظ عبدالوحید روپڑی کی رفاقت حاصل تھی۔ وہ غالباً کسی سرکاری نشست میں تھے۔ آئے تو پورا چمنستان آ گیا۔ معانقہ کے ساتھ اُن کے گرج دار قہقہے اور شبنمی گفتگو اُن کا امتیاز ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ علی گڑھ کے برادر امان اللہ خاں کی طرح پروفیسر لکھوی بھی ''ادارہ حلِ مشکلات'' ہیں۔

پاکستانی جامعات میں اساتذہ کی ترقی کی مشکلات اور انتظامیہ کی بے حسی اور لال فیتہ بندی پر نوحہ خواں تھے۔ ہندوستان میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی تجاویز اور سفارشات کو وہ بہت بہتر تصور کرتے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں معروف ادیب اور مصنف ممتاز احمد سالک بھی تشریف لے آئے۔ میں نے عرض کیا کہ میری خوش قسمتی ہے کہ سالک صاحب کی پی ایچ ڈی کا میں ممتحن تھا۔

پی ایچ ڈی کا ذکر ہوتے ہی پروفیسر لکھوی نے زوردار قہقہہ لگایا:

> ''وہی Ph.D جو بیس سالوں میں مکمل ہوئی تھی۔ میں ایم اے کا طالب علم تھا تب ممتاز احمد سالک پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ ڈاکٹریٹ کے لیے گلاسگو یونیورسٹی برطانیہ کا سفر کیا۔ وہاں سے واپس آیا تو اِن کا ریسرچ جاری تھا۔ پنجاب یونیورسٹی میں میری ملازمت پکّی ہوگئی تب بھی ان کی تحقیق مکمل نہ ہوئی تھی۔ انھوں نے سلوک کے مقاماتِ آہ وفغاں طے کر لیے تبھی تو سالک کہلائے۔''

اور ڈاکٹر ممتاز احمد سالک ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئے۔ میرے پیٹ میں بھی درد شروع ہوگیا۔ دھیرے دھیرے انھوں نے مقاماتِ آہ وفغاں کی پرتیں کھولیں۔ حل طلب مسائل، نگرانِ تحقیق کی بے اعتنائی، شعبے کی اندرونی سیاست وغیرہ جو آج عصری جامعات میں معمول کی کارروائی ہے۔

میں نے عرض کیا، ڈاکٹر اعجاز احمد سے بھی ملاقات پیش نظر ہے اور پروفیسر لکھوی نے از راہِ کرم انھیں طلب کر لیا۔ وہ آئے اپنے پورے طائفہ کے ساتھ اور چمنستانِ لکھوی کی شادابی بڑھ گئی۔

پروفیسر محمد ارشد، حافظ عبدالباسط، ڈاکٹر عاصم نعیم، ڈاکٹر محمد عثمان، جناب اسرار احمد، (ذاتی معاون امیر جماعت اسلامی جناب سراج الحق) ہم سب با جماعت ڈاکٹر شاہدہ پروین، ڈائرکٹر سیرت چیئر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے ہم سب کی چائے سے تواضع کی۔ وہاں ناظم دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مولانا محمد تقی امینیؒ (۱۹۴۶-۱۹۹۹ء) کا ذکرِ خیر ہوا۔ معلوم ہوا کہ اُن کی کتابیں ایم اے علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہیں۔ خاص طور سے ۱۔ مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر (۱۹۶۲ء)، ۲۔ احکامِ شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت (۱۹۷۰ء)، ۳۔ فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر زیادہ پسند کی جاتی ہیں۔

مدیر ترجمان القرآن کا اعتذار

اِس بار پاکستان ہائی کمیشن سے ویزا لیتے وقت یاد نہ رہا کہ پولیس رپورٹنگ سے مستثنیٰ کرنے کی درخواست کردوں۔ ویزا آفیسر نے ویسے بھی بڑی لیت ولعل کے بعد کچھ امید بندھائی تھی۔ اب ہر شہر میں پولیس رپورٹنگ دردسر ہوگئی۔ لاہور میں تو خیر بڑی سہولت سے خانہ پُری ہوگئی۔ ماڈل ٹاؤن کی پولیس چوکی میں تعینات افسر مہذب تھا۔ اُس نے بڑے سلیقے سے کاغذی کارروائی مکمل کی۔ ہوسکتا ہے کہ حافظ روپڑی کی موجودگی کا اثر رہا ہو۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر برقع پوش خاتون تشریف فرما تھیں۔ بڑی نفاست سے انھوں نے رہنمائی کی۔ بہاول پور میں دی اسلامیہ یونیورسٹی کا چوکی پولیس آفسر خرد ماغ تھا اور حسبِ توقع بدتہذیب بھی۔ اُس نے ہمیں بیٹھ جانے کی بھی پیش کش نہیں کی۔ ہم از خود صوفے پر براجمان ہوگئے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں استاد ہوں تب اُس کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ آئی اور فوراً رخصت ہوگئی۔

ملتان میں صدر شعبہ نے ایک ایسے ملازم کی خدمات حاصل کیں جس کے چچا پولیس چوکی ہی میں تعینات تھے۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر مستعدی سے بیٹھا نوجوان افسر ٹیلی فونک مجادلوں میں دیر تک مصروف رہ کر شانِ بے نیازی کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اُس کی ادا اچھی نہ لگی۔ میں کمرے سے نکل کر باہر صحن میں آ گیا اور میرے ساتھ نوجوان ملازم بھی۔ اُس نے اپنے چچا کو پھر فون کیا تو اندر سے طلبی ہوئی اور قدرے معذرت خواہی بھی۔

واپسی میں لاہور طیران گاہ پر پھر ایک بار اُسی غیر مہذب حرکت کا اعادہ ہوا۔ پولیس رپورٹنگ پر کچھ اشکالات پھر قائم ہوئے۔ پنجابی زبان میں افسر نے قدرے خفگی کا اظہار کیا۔ میں خاموش کھڑا تھا۔ ایک مسافر نے مدد کی۔ اُس نے اشارہ کیا، کوئی بات نہیں، آپ لاؤنج میں تشریف لے جائیں۔ یہ پولیس والوں کو بُرا بھلا کہہ رہا ہے۔

نماز عصر کی ادائیگی مسجد رحمانی ماڈل ٹاؤن میں ہوئی۔ چائے اور اخروٹ سے تواضع ہوئی اور ہم لوگ اپنی قیام گاہ واپس آ گئے۔ فون پر جناب سلیم منصور خالد سے رابطہ ہوا۔ استاذ گرامی مولانا نظام الدین اصلاحیؒ (۲۰۲۲-۱۹۲۸ء) پر ایک مضمون اُن کی خدمت میں ارسال کیا تھا، ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور میں اشاعت کے لیے۔ شاید انھیں مضمون پسند نہ آیا۔ ہر مدیر اپنی ذاتی پسند و ناپسند اور انا کے حصار میں ہوتا ہے اور غالباً اس سے مفر ممکن نہیں ہے۔ میں کئی تکلیف دہ واقعات کا ریکارڈ رکھتا ہوں۔

ششماہی علوم القرآن علی گڑھ کے فاضل مدیر ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی ایک دن شعبے میں از راہِ تکریم تشریف لائے۔ مولانا نظام الدین اصلاحیؒ کی وفات ہو چکی تھی۔ کہنے لگے: مولانا کے فہم قرآن پر ایک مضمون لکھ دیجیے۔ آپ اُن کے بزرگ شاگرد ہیں۔ مولانا کی زندگی اور خدمت کی تفصیل بھی آ جائے تو بہتر ہے۔ علوم القرآن کے تازہ شمارے میں شائع ہو جائے گا۔

ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی کے علم و فضل سے میں واقف تھا اور اُن کے کردار کا قائل بھی۔ میں نے عرض کیا: مجھے استاذ گرامی کو خراج پیش کرنا تھا۔ اچھا ہے ششماہی علوم القرآن میں شائع ہو جائے۔

میں نے پندرہ بیس دن میں مضمون مکمل کیا اور ڈاکٹر عرفات ظفر اصلاحی کی معرفت انھیں بھیج دیا۔ ایک ہفتہ بعد وہ خود تشریف لائے۔ انھیں مضمون کے بیشتر مشمولات سے اختلاف تھا۔ جگہ جگہ نشان زد مضمون وہ واپس کر گئے کہ تدوین جدید کے بعد ہی قابلِ اشاعت ہوگا۔ اُس مضمون میں مولانا سلطان احمد اصلاحیؒ (۲۰۱۶-۱۹۵۲ء) کے بعض ظالمانہ تبصروں پر استاذ گرامی کی شدید تنقید موجود تھی جو ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی جیسے روشن خیال عالم کو بھی راس نہیں آئی۔ آخر کار مجلّہ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شمارہ ۲۰۲۲ء میں وہ مضون شائع ہوا۔

ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی کی ناپسندیدگی اور مضمون کی اشاعت سے اُن کا انکار تو قابلِ فہم ہے کہ فضلائے مدرسۃ الاصلاح پر کسی علمی و فکری تنقید کے وہ متحمل نہ تھے خواہ اسلوبِ بیان کتنا شائستہ ہو مگر

مدیر ترجمان القرآن جناب سلیم منصور خالد پر ایسی کون سی آفت آئی تھی، راقم سمجھنے سے قاصر تھا۔ یہ کوئی دلیل نہ تھی کہ اس شمارہ میں پروفیسر خورشید احمد کا ایک طویل سوانحی مضمون پہلے سے شامل ہے۔

اس سے پہلے ایک بار ''جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون' پر بھی ایک طویل مضمون میں نے ترجمان القرآن لاہور کو اشاعت کی غرض سے بھیجا تھا۔ مہینوں بعد انھوں نے بتایا کہ مضمون صاف نہیں ہے، انھیں صاف نقل بھیجی جائے۔ دوبارہ حکم کی تعمیل ہوئی مگر جناب سلیم منصور خالد کی سلامتِ طبع مضمون شائع کرنے سے معذور رہی۔ اب وہی مضمون ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کی توجہ سے سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ میں شائع ہوا ہے جس کا اعتبار و استناد اردو جرائد کی دنیا میں مسلّم ہے۔ جناب سلیم منصور خالد نے فون پر ملاقات کرنے سے معذرت کی کہ رسالہ پریس جانے کو تیار ہے۔ سانس لینے کی فرصت نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے وہ واقعی معذور رہے ہوں۔

تجدید و تجدّد کی منہاجیات

۲۲ر نومبر ۲۰۲۲ء کو شیخ زائد اسلامک سنٹر پنجاب کے آڈیٹوریم میں علمی مذاکرہ تھا۔ موضوع تھا: ''فہمِ قرآن میں تجدید و تجدّد کی منہاجیات''۔

نظامت ڈاکٹر حافظ عبدالباسط خاں نے کی۔ کلماتِ تشکر و ترحیب ڈاکٹر اعجاز احمد ڈائرکٹر نے ادا کیے۔ ڈاکٹر عاصم نعیم نے آخر میں دعائیہ کلمات کہے۔ گفتگو طویل تھی اور محرک سوالات بھی۔ بے پناہ خوشی ہوئی کہ طلبہ و طالبات اور اساتذہ نے سنجیدگی سے سنا۔ تنقیدیں بھی ہوئیں اور دیانت سے اختلاف کا اظہار بھی۔

میری گفتگو مکمل ہوئی تو ایک طالب علم نے آگے بڑھ کے سوال کیا اور قدرے خفگی کا اظہار بھی:

> ''آپ کی گفتگو میں مولانا حمیدالدین فراہیؒ، مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور جاوید احمد غامدی کے حوالے کثرت سے آئے ہیں۔ یہ لوگ منکرینِ سنت میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کی رائے کیا ہے؟ انھیں مجدد نہیں متجدد کہنا چاہیئے۔''

میں نے سنجیدگی سے عرض کیا:

> ''منکرینِ سنت کی اصطلاح بڑی خطرناک ہے۔ سنت کا انکار و استخفاف

آدمی کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ میں ان مفسرین قرآن اور متکلمین کی متعدد رایوں سے سخت اختلاف رکھتا ہوں۔ ان کے موقفِ حدیث کی تائید میں کبھی نہیں کرسکتا۔ مگر انھیں منکرین حدیث کی صف میں کھڑا کرنا بڑی جسارت ہے۔ آپ ان کے افکار کا تنقیدی مطالعہ کریں مگر انھیں مفسر قرآن اور متکلم اسلام کی فہرست سے خارج نہ کریں۔''

ایک ریسرچ اسکالر نے فلسفہ وعلم کلام کا مسئلہ چھیڑ دیا: مفسرین کی خدمات اپنی جگہ مسلّم ہیں مگر تاریخی طور پر اشاعرہ اور ماتریدیہ جیسے کلامی مکاتب فکر کو فروغ کیوں نہیں دیا جب کہ آج کے الحاد کا منطقی وفلسفیانہ ردان کلامی مکاتب میں موجود ہے؟

میں نے عرض کیا: اشعری، ماتریدی اور معتزلی افکار وکلامیات نے تاریخ اسلام کے ایک مخصوص دور میں دفاعِ اسلام کا فریضہ انجام دیا۔ یونانی فکر وفلسفہ کی تردید میں ان متکلمین اسلام نے اپنی زندگیاں کھپا دیں مگر آج مغرب کے فکر وفلسفہ کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ آج کا الحاد یونانی الحاد سے زیادہ خطرناک ہے۔ تاریخ اسلام کا کلامیہ آج کے کفر والحاد کے سدّ باب کے لیے کافی نہیں ہے۔ آج اکیسویں صدی میں ایک نئے کلامیہ کی ضرورت ہے جس کی جڑیں قرآن وسنت میں براہِ راست پیوست ہوں۔

عبدالغفار حسنؒ کا رجوع

ایک استاذ کا سوال بڑا بنیادی تھا: دورِ جدید میں قرآن فہمی کے لیے فکر وشعور کی آزادی کس قدر ضروری ہے؟ اور کیا شعوری آزادی اور جدّتِ افکار میں کوئی باہمی ربط ہے؟

میں نے عرض کیا: فکری آزادی قرآن فہمی کے لیے ضروری ہے اور ہدایت طلبی کے لیے بھی۔ علمی وذہنی غلامی فکر وتحقیق کی راہ کا سب سے بڑا حجاب ہے۔ آج مغرب کی فکری غلامی میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت مبتلا ہے۔ اسلاف کی منہاجیات اور کلامیہ کے اسیر ہمارے علماء ہیں۔ وہ تاریخ کی روایات ورسوم کی قید سے نکلنا نہیں چاہتے۔ ان دونوں مکاتب فکر پر محمد اقبال نے شدید تنقید کی ہے:

مجھ کو تو سکھادی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملّا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی

تقدیر شکن قوّت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی
تیرے بھی صنم خانے، میرے بھی صنم خانے
دونوں کے صنم خاکی، دونوں کے صنم فانی

مگر آزادیٔ فکر کے اظہار کے آداب ہیں۔ وحی الٰہی سے ماورا اس کا دائرہ بہت وسیع ہے تاہم سلیقہ اور نفاست ناگزیر ہے ورنہ یہ فکری آزادی لاقانونیت اور بے سمتی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اقبال ہی نے کہا تھا:

آزادیٔ افکار سے ہے اُن کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر وتدبّر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

میں نے وضاحت کی: فکر آزاد ہو، تحقیق پر قدغن نہ ہو تب ہی جدّت اور تازہ کاری ہوتی ہے۔ تنوع اور بوقلمونی سے شادابی آتی ہے اور کاروانِ علم وتہذیب کی تیز گامی ممکن ہو پاتی ہے۔

ڈاکٹر حافظ حسن مدنی شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی کے موقر استاذ ہیں اور ماہنامہ محدث لاہور کے مدیر شہیر بھی۔ سلفی الفکر ہیں اور متوازن صاحب قلم۔ اُن کا اشکال بڑا اہم تھا:

''دورِ نبوی کی لغت قرآن فہمی کے لیے کافی ہے پھر دورِ جاہلیت کے عربی ادب اور شاعری پر اتنا زور کیوں ہے؟ سلفی المسلک مولانا عبدالغفار حسنؒ (۱۹۱۳ء-۲۰۰۷ء) جماعتِ اسلامی کے اولین رہنماؤں میں سے تھے۔ الیکشن کے مسئلہ پر اختلاف ہوا تو جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔ احادیث کی اردو میں تشریحات، جو عام مسلمانوں کے لیے اس نامور محدث نے کی ہیں، آج سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ انھوں نے لغات القرآن میں قرآن فہمی کے لیے جاہلی ادب کے مطالعہ کو ضروری قرار دیا تھا، اُن کے صاحب زادے ڈاکٹر صہیب حسن کی روایت ہے کہ والد مرحوم نے اپنے

اِس موقف پر نظر ثانی کی تھی اور آخر عمر میں اس سے رجوع کر لیا تھا۔''

سلفی علمائے ہند و پاک کی یہ ترجمانی تھی اور بڑی حد تک درست تھی۔ اسی لیے میں نے اُن کی تصویب کی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید کی جو تفسیر منقول ہے اور جسے محدثین کرام نے اپنے مجموعہ ہائے حدیث میں کتاب التفسیر کے تحت محفوظ کر دیا ہے، اُس کو تسلیم کرنا واجب ہے کہ وہ وحی الٰہی کا حصہ ہے۔

مگر غور طلب امر یہ ہے کہ دورِ نبوی اور دورِ صحابہ کی لغاتِ قرآنی عربی جاہلی ادب سے متصادم نہیں، موافق ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ تفسیر نبوی کا ذخیرہ بہت مختصر ہے۔ قرآن مجید کی آیات مزید تفسیر وتشریح کی متقاضی ہیں۔ یہ جدید تفسیریں قرآن کی آیات اور احادیث صحیحہ سے متصادم نہ ہوں، اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ فہم قرآن کی تجدید اور عصری تعبیر وقت کی ناگزیر ضرورت ہے۔

مقتدیٰ حسن ازہریؒ کا موقف

میں نے اُس موقر اجلاس میں ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ (۲۰۰۹-۱۹۳۹ء) کا ایک واقعہ سنایا۔ ۱۹۹۴ء میں جامعہ سلفیہ بنارس میں توسیعی محاضرات کا ایک ہفتہ منایا گیا۔ ڈاکٹر ازہری وہاں کے ریکٹر تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انھوں نے عربی زبان وادب میں ایم اے کیا تھا اور ڈاکٹر مختار الدین احمد مرحوم سابق صدر شعبہ عربی کی نگرانی میں پی ایچ ڈی بھی۔ طلبہ کی معلومات میں توسیع اور فکر میں روشن خیالی کی غرض سے انھوں نے اپنے اصاغر واکابر احباب کو جمع کیا۔ اُن کے نام مجھے یاد ہیں کیوں کہ آزادی اور دستور ہند پر دو محاضرے میرے ذمے تھے۔ اساتذہ کی اِس فہرست میں سب سے کم عمر میں تھا:

(۱) پروفیسر سید ضیاء الحسن ندویؒ، جامعہ ملیہ اسلامیہ (۲) پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں ندوی ازہری (۳) پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقیؒ (۴) پروفیسر کفیل احمد قاسمی (۵) ڈاکٹر محمد اعظم قاسمی۔

وقت مقررہ پر ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ پروفیسر صدیقی نے ڈاکٹر محمد اعظم قاسمی سے ازراہِ تفنن پوچھا، ریلوے ٹکٹ آپ لے کر آئے ہیں یا اُسے گھر پر بھول گئے ہیں؟ وہ ان کے نسیان وذہول سے آگاہ تھے کیوں کہ یار غار تھے۔ استاد گرامی نے مسکرا کے جواب دیا کہ انھوں نے پیشگی ٹکٹ شیروانی کی

جیب میں رکھ لی ہے۔ پروفیسر صدیقی اُن کی افتادِ طبع کے آشنا تھے۔ اصرار کیا کہ ٹکٹ نکال کے میرے ہاتھ میں رکھیے تب یقین آئے گا۔

ڈاکٹر محمد اعظم قاسمی نے زوردار قہقہہ لگایا: ''یٰسین صاحب، میری افتاد نے جو آپ کا مطالعہ کیا ہے وہ بڑا ناقص ہے۔ اپنا زاویۂ نظر آپ تبدیل کیجیے۔'' پروفیسر صدیقی ہاتھ پھیلائے رہے کہ ٹکٹ نکالیے۔ اب استادِ گرامی سنجیدہ ہوئے۔ شیروانی کی اگلی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اُن کی تشویش ظاہر ہوگئی۔ دونوں بغلی جیبوں کی تلاشی لی تو ٹکٹ دستیاب نہ ہوسکا۔ یکا یک انھیں یاد آ گیا۔ ٹکٹ تو انھوں نے شیروانی کی جیب میں رکھا تھا مگر شیروانی تبدیل کر لی تھی۔ اُن کے صاحب زادے اسکوٹر سے تیزی سے روانہ ہوئے اور ٹرین کے پلیٹ فارم پر آتے آتے وہ ٹکٹ لے کر آ گئے۔ تب سب کے حواس بحال ہوئے۔

جامعہ سلفیہ بنارس میں محاضرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ دو تین دن گزرے تھے کہ طلبہ نے اپنے سالانہ میگزین المنار کے کچھ شمارے فاضل مقررین کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر پیش کیے۔ پروفیسر سید ضیاء الحسن ندویؒ نے رسالہ کی ورق گردانی شروع کی تو ایک مضمون پر آ کر رک گئے۔ مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ گجرانوالہ (۱۹۶۸-۱۸۹۵ء) نے انکارِ حدیث پر گفتگو کی تھی اور منکرین حدیث کے دو تین طبقات شمار کیے تھے۔ اس طبقہ سازی میں انھوں نے استخفافِ حدیث کرنے والوں کا ایک گروہ بتایا تھا جس میں سرسید احمد خاں، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور امین احسن اصلاحی تک کو انھوں نے معاف نہیں کیا تھا۔

پروفیسر سید ضیاء الحسن ندویؒ نے فاضل مقررین سے گفتگو کی:

> ''یہ طلبہ ہم سب کو منکرِ حدیث سمجھتے ہیں کیوں کہ ان کے اکابر علماء کی یہی رائے ہے۔ ہماری آمد، محاضرہ، سوال و جواب سب عبث ہے۔ ازہری صاحب نے خواہ مخواہ ہمارا وقت برباد کیا ہے۔''

اور اُسی وقت ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ کو طلب کیا اور اپنی سخت تشویش اُن کے سامنے رکھی۔ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقیؒ بھی سخت کبیدہ خاطر تھے۔ ڈاکٹر ازہری نے اطمینان دلایا۔ اگلے دن محاضرہ سے پہلے وہ طلبہ سے روبرو ہوں گے۔ ریکٹر جامعہ سلفیہ نے اگلے دن افہام و تفہیم کی۔ تمام طلبہ و اساتذہ

سے خطاب کیا:

''عزیزو! مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ نے انکارِ حدیث کرنے والوں کے جو طبقے بنائے ہیں، ہوسکتا ہے کہ اس میں اُس دور کے مخصوص حالات کو دخل ہو۔ وہ دور مناظروں کا تھا۔ مختلف مسالک کے علماء ایک دوسرے سے مناظرے کرتے تھے۔ منکرینِ حدیث کی یہ طبقہ سازی اُسی مناظراتی ذہن کی عکاسی ہے۔ آپ سارے علماء کی تحریروں کا مطالعہ کریں اور کتاب وسنت کی کسوٹی پر انھیں پرکھیں۔ یاد رکھیے، اعتدال اور توازن اسلام کی نمایاں صفت ہے۔''

اس ہفت روزہ محاضرات پروگرام کے بیشتر مقررین حنفی المسلک تھے چنانچہ اہلِ حدیث جریدہ ترجمان نئی دہلی میں اس پر تنقید بھی شائع ہوئی تھی۔

ڈاکٹر حافظ حسن مدنی پر اللہ اپنی رحمتوں کی بارش کرے اور انھیں تمام شرور وفتن سے محفوظ رکھے۔ انھوں نے کھڑے ہوکر ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ کے موقف کی تائید کی اور اس موقف کی تشہیر اور اعلانِ عام پر زور دیا۔

راؤ عرفان خانؒ کی قرآنی تعبیرات

ایک طالبِ تحقیق نے سرسید احمد خانؒ (۱۸۹۸-۱۸۱۷ء) کے تفسیری منہج پر اشکال قائم کرتے ہوئے یہ سوال کیا کہ اُن کی منہاجیات سے قریب ترکس مفسر نے فہم قرآن میں کوئی راہ دکھائی؟

سوال بظاہر بے ضرر تھا مگر وسیع تر مطالعہ کا متقاضی تھا۔ میں نے مفسرین قرآن میں مصر کے شیخ طنطاوی جوہری (۱۹۴۰-۱۸۷۰ء) کا نام لیا جن کی **تفسیر الجواھر فی تفسیر القرآن کریم** کلامِ الٰہی کی سائنسی تفسیر کا نمونہ ہے۔ قرآن اور سائنس میں تطابق تلاش کرتے ہوئے فاضل مفسر نے بسا اوقات دور از کار تاویلات کو اختیار کیا ہے اور اسی لیے قابلِ تنقید قرار پائے ہیں۔

ترکی کے صوفی اسکالر شیخ بدیع الزماں سعید نورسی (۱۹۶۰-۱۸۷۶/۱۸۷۹ء) نے بھی قرآنی معجزات کی سائنسی توجیہ پیش کی ہے۔ میں نے اپنی ایک حالیہ تصنیف کا حوالہ بھی دیا:

Miracles of the Prophets- Said Nursi's Readings in the Science Perspective, Department of Islamic Studies, Alighrh Muslim University, India, 2019.

میں نے مزید وضاحت کی۔ سرسید احمد خاں اس منہج میں نئے نہیں ہیں۔ تیرہویں صدی ہجری میں شیخ محمد بن احمد اسکندرانی نے اسی منہج کو اختیار کرتے ہوئے معروف تحقیق پیش کی تھی عربی زبان میں، جس کا نام تھا "**کشف الاسرار النورانیة فیما یتعلق بالاجرام السّماویة الارضیة والحیوانات والنباتات والجواهر المعدنیة.** مکتبہ وہبہ مصر نے ۱۲۹۷ھ میں تین جلدوں میں یہ کتاب شائع کی۔

پروفیسر محمد ارشد صاحب علمی شخصیت ہیں اور دائرہ معارف اسلامیہ جیسے تاریخ ساز علمی پروجیکٹ کا حصہ رہے ہیں۔ اُن کا سوال ڈاکٹر راؤ عرفان احمد خانؒ شکاگو (۲۰۱۸-۱۹۳۱ء) کی انگریزی تفسیر

Reflections of the Quran- Understanding Surah al- Fatiha and Surah al- Baqara.

کے منہج سے متعلق تھا۔ یہ تفسیر دی اسلامک فاؤنڈیشن برطانیہ سے ۸۲۷ صفحات پر مشتمل ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی ہے۔ اُن کی ایک دوسری تحقیق کا عنوان ہے:

An Exercise in Understanding the Quran, An Outline Study of the Last Thirty Divine Discourses (Surah no. 85-Surah no. 114.

یہ کتاب شکاگو سے ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئی۔

ڈاکٹر راؤ عرفان احمد خانؒ پر ۲۰۱۶ء میں ڈاکٹر تنویر عظمت نے لوتھرون اسکول آف تھیالوجی شکاگو میں مقالہ ڈاکٹریٹ جمع کیا ہے جس کا عنوان ہے:

Understanding the Quranic Revelation
The Dynamic- Hermeneutic of Irfan A. Khan.

ڈاکٹر ارشد کا سوال اسی Quranic Hermeneutic قرآنی تعبیرات پر تھا۔ اردو کی یہ

تعبیر ڈاکٹر تنویر عظمت نے اپنے ایک اردو مقالہ میں اختیار کی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس منہج مطالعۂ قرآن کو اردو میں نام دوں: ''خود توضیحی منہجِ تفسیر''

ڈاکٹر ارشد یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ یہ منہج تفسیر اور اس کی روشنی میں قرآن مجید کی بعض سورتوں کی تشریح کارِ تجدید ہے یا کارِ تجدد؟

میں نے جواب دیا کہ بلاشبہ یہ کارِ تجدید ہے۔ فاضل مفسر کا زور فہم قرآن میں قرآن مجید کی داخلی شہادتوں اور تعبیرات پر ہے۔ وہ خارجی وسائل تفسیر وفہم قرآن کے منکر نہیں ہیں۔ البتہ انھیں ثانوی درجہ دیتے ہیں اگر کوئی شخص قرآن پڑھے تو اس کا مدلول واضح ہوتا جائے گا بشرطیکہ اس کی نیت حصولِ ہدایت کی ہو۔ یہی وہ پہلو ہے جس پر ڈاکٹر راؤ عرفان احمد خاںؒ کا زور ہے۔ وہ نزولِ قرآن کے سماجی تہذیبی تناظرات کا انکار نہیں کرتے۔

ڈاکٹر راؤ عرفان احمد خاںؒ کی خدمات وافکار پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کچھ تعارفی کام ہوا ہے۔ پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی اور پروفیسر ضیاء الدین فلاحی نے بعض مضامین شائع کیے ہیں۔ پروفیسر عبدالحمید فاضلی کی نگرانی میں شعبہ علوم اسلامیہ میں ایک خاتون رقیہ اسلم ڈاکٹریٹ کا مقالہ ترتیب دے رہی ہیں۔ انھوں نے فاضل مفسر کے آبائی وطن سہارنپور اتر پردیش کا سفر بھی کیا ہے اور اُن کے اعزہ سے مصاحبہ کیا ہے۔ فاضل مفسر سے راقم کا تعامل بہت پرانا ہے۔ ۱۳-۲۰ رجون ۱۹۷۷ء میں نیپال کے پُر فضا شہر پوکھرا میں اسلامی طلبہ تحریک نے جو تاریخ ساز تربیتی کارگاہ منعقد کی تھی اُس میں ڈاکٹر راؤ عرفان احمد خاں اپنے صاحب زادے اور بیٹی نُصحیٰ پروین کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ میں نے اس کیمپ کی روداد مجلّہ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جلد ۳۶، ۲۰۲۰-۲۰۱۹ء میں شائع کر دی ہے۔ عنوان ہے:

بدنام کریں گی زنجیریں
پوکھرا نیپال کے ایک دینی وتربیتی کیمپ کی روداد

مجروح سلطان پوری کی لفظیات

ڈاکٹر اعجاز احمد، ڈائرکٹر شیخ زائد اسلامک سنٹر نے آخر میں رفعِ اختلافات کی خاطر تبصرہ کیا

اور یہ علمی مذاکرہ گویا تکمیل کو پہنچا۔ انھوں نے فرمایا:

''فاضل مقرر کی تقریر سے جو الجھن پیدا ہو رہی تھی وہ اُن کی توضیحات سے دور ہو گئیں کہ قرآن مجید اور احادیث نبویہ کی روشنی میں جو تفسیر ہو گی وہی معتبر ہو گی۔''

لیجیے تجدید اور تجدد کی ساری بحثیں اس روایتی بیانیہ کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ عام طور سے اسی طرح کے روایتی منہج کا سہارا لیا جاتا ہے جس کے درست ہونے میں کوئی کلام نہیں مگر تفسیر عصر اور اصلاح وتجدید کے سارے تقاضے اس کے نیچے دب کر رہ جاتے ہیں۔

چائے کی میز پر زندہ دلانِ لاہور نے پھر بحث چھیڑ دی۔ ''ایک صاحب علم وادب شخصیت'' نے، افسوس ہے کہ اُن کا نام ڈائری میں محفوظ نہ رہ سکا، اپنا تجربہ بیان کیا۔ مختلف مکاتبِ فکر کے حوالوں سے قرآن کا مطالعہ راہِ ہدایت سے بھٹکا دیتا ہے۔ قرآن سے ہدایت اُسی صورت میں حاصل ہوتی ہے جب کہ فکر وشعور آزاد ہو۔ اُس پر کسی مکتبِ فکر کی پابندی واجب نہ ہو۔

لیجیے۔ پُرشور مباحثہ پھر شروع ہو گیا۔ ایک گھنٹہ سے زائد کی گفتگو نے مجھے مضمحل کر دیا تھا اور قدرے پُرسکون بھی۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب تھا اہلِ علم کو بحث ونظر کی دعوت دے کر۔ مجھے اُن کے آزادانہ ردِّعمل کا انتظار تھا اور اس کے لیے بہترین جگہ لاریب چائے کی میز تھی۔ ڈاکٹر شاہدہ پروین نے بحث میں حصہ لینا ضروری سمجھا:

ڈاکٹر اور طبیب کی طرح عالمِ قرآن کا وسیلہ ضروری ہے۔ ڈاکٹر سے مشاورت کے بغیر جو دوا استعمال کی جاتی ہے وہ اکثر مرض کو بڑھا دیتی ہے۔

ڈاکٹر مبشر حسین خاموشی سے سن رہے تھے۔ اُن کا روئے سخن میری طرف تھا:

''تجدید اور تجدد میں فرق کون کرے گا؟ کیسے پتہ چلے گا کہ یہ قرآن فہمی تجدید کی نمائندہ ہے اور دوسرا فہم تجدد کا ہے؟''

ڈاکٹر اعجاز احمد نے آگے بڑھ کے جواب دے دیا اور گویا میری تھکاوٹ انھوں نے محسوس کر لی۔

''امّت کے اندر جس فکر وفہم کو قبولیت حاصل ہو وہ تجدید ہے ورنہ تجدد ہے۔''

ڈاکٹر حافظ حسن مدنی نے ڈائرکٹر شیخ زائد اسلامک سنٹر کی اپنے انداز میں تصویب کی:

''کتابیں ہزاروں لکھی جاتی ہیں مگر مقبول چند ہی ہو پاتی ہیں اور اس طرح سوادِ اعظم کی تائید انھیں حاصل ہو جاتی ہے۔''

''صاحب علم وادب'' نے پھر گرہ لگائی: فہم قرآن میں آزادیٔ فکر وشعور کے حوالے سے انھیں مجروح سلطان پوری کا ایک شعر یاد آ گیا۔ مجروح کو معشوقہ کی آنکھوں میں آیاتِ الٰہی کے جلوے نظر آتے تھے۔ میں اس پر کوئی تبصرہ کرنے سے قاصر تھا۔

ہندو خواتین سے شادی

جناب خالد مسعودؒ مولانا اصلاحیؒ کے تلمیذ، فکر فراہیؒ کے عالم، محقق اور مترجم قرآن کے صاحب زادے جناب حسّان عارف آڈیٹوریم میں موجود تھے۔ اب چائے کی میز پر اُن سے تعارف اور معانقہ ہوا۔ پروفیسر ابوسفیان اصلاحی کے ذریعہ اُن سے غائبانہ عقیدت پہلے سے تھی۔ سرسید احمد خاں کی معروف زمانہ کتاب ''تبیین الکلام'' نئے رنگ وروغن کے ساتھ کراچی سے طبع ہوئی ہے۔ پروفیسر اصلاحی نے بھی اس کی تحقیق میں خون پسینہ بہایا ہے۔ جلد اول کی ایک کاپی مجھے تحفے میں عنایت کی اور اپنے والد کے مضامین کا مجموعہ بھی:

''توضیحاتِ فکر فراہیؒ'' از علامہ خالد مسعود، تلمیذ مولانا امین احسن اصلاحیؒ [جلد دوم] ترتیب حسّان عارف اور محسن فارانی، مجلس حزب الانصار، بھیرہ، سرگودھا (پاکستان) اکتوبر ۲۰۱۶ء

نماز ظہر ہم نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کی مسجد میں ادا کی۔ وضوخانہ میں ایک نمازی سے تعارف ہوا تو انھوں نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔

''فاتحِ سندھ محمد بن قاسمؒ (متوفی ۷۱۷ء) نے ہندو لڑکیوں سے شادی کو جائز قرار دیا تھا۔ اُس وقت ہندوستان میں مسلمان خواتین نایاب تھیں؟''

میں نے عرض کیا۔ دونوں باتیں درست نہیں معلوم ہوتی ہیں۔ محمد بن قاسمؒ کوئی مفتی یا قاضی نہیں تھے۔ یہ بات میرے علم میں نہیں ہے کہ انھوں نے ہندو لڑکیوں سے شادی کو جائز قرار دیا تھا۔ اس کے برعکس مولانا سید سلیمان ندویؒ (۱۹۵۳-۱۸۸۴ء) نے اپنی معروف کتاب ''عرب وہند کے تجارتی

تعلقات'' میں صراحت کی ہے کہ اُس دور میں ہندوؤں کو ''شبہ اہل کتاب'' کا درجہ حاصل تھا مگر ہندو خواتین سے، جب تک وہ اسلام نہ قبول کرلیں، شادی درست نہ سمجھی جاتی تھی اور مسلمان خواتین نایاب نہ تھیں۔ جن ہندوستانیوں نے عربوں کے حسن اخلاق کو دیکھا اور اسلام کے تصور مساوات اور وحدت بنی آدم کا عملی مظاہرہ اُن کے سامنے ہوا انھوں نے اسلام قبول کرلیا اور اُن کے اہلِ خانہ نے بھی ہندومت کو خیر باد کہہ دیا۔

پاکستانی نوجوان کا دوسرا سوال تھا:

''کیا کسی عالم دین نے ہندو خواتین سے شادی کو درست قرار دیا ہے؟''

میں نے لاعلمی ظاہر کی۔ کتابیہ یعنی یہودی وعیسائی خواتین سے نکاح کی اجازت پر علمائے اسلام کا تقریباً اجماع ہے بشرطیکہ وہ محصنہ یعنی پاک دامن ہوں مگر ہندو خواتین کو اس فہرست سے خارج رکھا گیا ہے۔

حافظ عبدالوحید روپڑی کی قیادت میں نماز ظہر سے واپسی ہوئی۔ آج کا علمی مذاکرہ اور اُس میں ہونے والے مباحث اُن کے لیے چشم کشا تھے۔ کہنے لگے:

''یہ بات بالکل صحیح ہے کہ جس طرح مجھے اپنی بات کہنے کی پوری آزدی ہے اُسی طرح مخاطب کو بھی ہے۔ ہمیں تحمل سے اُس کی پوری بات سننا ہوگی اور اُس کے استدلال پر غور کرنا ہوگا۔ مخاطب کو یقین دلانا ہوگا کہ ہم اُس کی رائے کے تئیں سنجیدہ ہیں۔ اُسے تسلیم کرنا یا رد کرنا ہمارے اختیار میں ہے۔''

میں نے بڑی لجاجت سے عرض کیا:

''اسلام میں اختلاف کے آداب یہی ہیں۔ اِسی سے اتحاد کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ ہمارے علماء اور دانش ور جتنی جلد اِس حقیقت کو سمجھ لیں بہتر ہے۔''

کثرتِ ازدواج کا جہاد

مولانا سلطان احمد اصلاحیؒ کہا کرتے تھے: جس شخص نے دو شادیاں کیں اور دونوں خواتین اُس کی معاشرت میں زندگی گزار رہی ہیں وہ سچا مجاہد ہے۔ زندگی بھر دونوں کے مسائل کو خوش اسلوبی

سے نمٹانے کا جہادِ مسلسل اس کی مغفرت کے لیے کافی ہے۔ میں نے ایک بار عرض کیا: شاید آپ ریاضت اور مجاہدہ کے معنی مراد لے رہے ہیں۔ کہنے لگے، نہیں جہادِ مسلسل مراد ہے۔ یہاں حال یہ ہے کہ ایک بیوی سے انصاف نہیں کر پا رہے ہیں، اگر کوئی مرد مجاہد دو بیویوں سے انصاف کرنے لگے تو اس کی افضلیت کا انکار کون کر سکتا ہے۔

شام کو ڈاکٹر منیر احمد رسول پوری اور ڈاکٹر سیف اللہ فیضی تشریف لائے تو حافظ عبدالوحید روپڑی نے چہک کر کہا:

''جب سے آپ لاہور تشریف لائے ہیں ایک بڑی مسرت انگیز اور نا قابلِ یقین خبر آپ کو سنانے کے لیے بے تاب ہیں۔ ڈاکٹر منیر نے جلد ہی ایک حافظۂ قرآن بیوہ سے دوسری شادی کی ہے جس کے تین بچے ہیں۔''

میں حیران ہوا۔ کتنا بے خبر تھا میں۔ ڈاکٹر منیر کی بیوی کی رحلت سے میں ناواقف رہا۔ اور ہمارے اِن دوستوں نے بھی مجھے بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ میری زبان سے برجستہ نکلا۔ **انا للّٰہ وانا الیہ راجعون.**

حافظ روپڑی ذکی الحس بھی ہیں اور فطین بھی۔ پہلے تو سراسیمہ ہوئے پھر زوردار قہقہہ لگایا:

''آپ نے بالکل غلط سمجھا۔ پہلی بیوی حیات ہیں اور اپنے بچوں کے ساتھ خوش و خرم بھی۔ دونوں بیویاں ماشاءاللہ صاحبِ اولاد ہیں اور ایک ہی مکان میں اپنے شوہر کے ساتھ لطف اندوز ہو رہی ہیں۔ نکاح ڈاکٹر سیف اللہ فیضی نے پڑھایا اور میری قیمتی بڑی گاڑی سے دلہن کی رخصتی عمل میں آئی۔''

میں متحیر تھا۔ سوالات کلبلا رہے تھے:

''لیکن نکاحِ بیوگان کی اس سنت کی تجدید ممکن کیسے ہوئی؟ کیا پہلی بیوی نے، اس کے اقارب نے مزاحمت نہیں کی؟''

حافظ روپڑی اور ڈاکٹر فیضی دونوں نے فلک شگاف قہقہے لگائے:

''یہی تو اس نا قابلِ یقین معجزہ کا کلائمکس (نقطۂ عروج) ہے۔ پہلی بیوی کے والدین خود رشتہ لے کر دوسری بیوی کے گھر گئے۔ انھوں نے ڈاکٹر منیر

کے والدین کا فریضہ سعادت سمجھ کر ادا کیا۔

حیرتوں پر حیرتیں۔ مجھے کہنا پڑا:

''آپ لوگ صادق بھی ہیں اور امین بھی۔ مگر مجھے اپنی سماعتوں پر اعتبار نہیں۔ میں دونوں بیویوں سے ملاقات کرلوں تو یہ تاریخ ساز واقعہ میرے سفرِ لاہور کی سوغات بن جائے۔''

ڈاکٹر منیر نے ٹھٹھا لگایا:

''چشمِ ما روشن دل ما شاد!''

اور برجستہ قرآن مجید کی یہ آیت پڑھ دی: ذٰلِکَ مَا کُنَّا نَبْغِ (الکہف:۶۴) ''یہی تو ہم چاہتے تھے۔''

''ہمارے اہلِ خانہ خود آپ کو خیر مقدم کہنے کے لیے بے تاب ہیں۔ آپ کی مصروفیات کی وجہ سے ہم دعوت دینے کی ہمت نہیں جٹا پا رہے تھے۔ آپ بہاول پور اور ملتان کی مہمات سے فارغ ہو کر واپس آئیں ہم سب آپ کو مرحبا کہنے کے لیے بے چین ہیں۔''

اور میں نے قرآن مجید کی درج ذیل آیت تلاوت کی:

يَـا أَبَـانَا مَا نَبْغِيْ هَـٰذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا وَنَمِيْرُ أَهْلَنَا وَنَحْفَظُ أَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ذَٰلِكَ كَيْلٌ يَسِيْرٌ. (یوسف:۶۵)

''ابّا جان! اور ہمیں کیا چاہیے۔ دیکھیے یہ ہمارا مال بھی ہمیں واپس دے دیا گیا ہے۔ بس اب ہم جائیں گے اور اپنے اہل وعیال کے لیے رسد لے کے آئیں گے۔ اپنے بھائی کی حفاظت بھی کریں گے اور ایک بارِ شتر اور زیادہ بھی لے آئیں گے۔ اتنے غلے کا اضافہ آسانی کے ساتھ ہو جائے گا۔''

ڈاکٹر منیر احمد رسول پوری کو تبریک کہ انھوں نے نکاحِ بیوگان کی سنت نبھائی اور اصلاحِ معاشرہ کی مہم میں عملی حصہ داری کو یقینی بنایا۔ دل سے دعا نکلی کہ وہ ثابت قدم رہیں۔ پہلی بیوی کی حق تلفی

نہ ہو اور دونوں کی اولاد سعادت و ترقی سے ہم کنار ہو۔

ضیافت اور ایثار کا نمونہ

نماز مغرب کے بعد تاخیر سے ڈاکٹر شاہد حنیف اور ڈاکٹر حافظ حسن مدنی ایک بشارت عظمیٰ کے ساتھ تشریف لائے۔ ہم لوگ دسترخوان پر بیٹھ چکے تھے مگر حافظ عبداللہ روپڑی اور اُن کے اہلِ خانہ کمال درجہ کے مہمان نواز ہیں۔ اکثر اُن کے دسترخوان پر اللہ کے مہمانوں کی بڑھتی تعداد دیکھی ہے اور مَن وسلویٰ کا نزول بھی۔ پتہ نہیں وہ کیسے انتظام کرتے ہیں۔ صاحب خانہ گھر میں موجود نہ ہوں تب بھی سعادت مند بیٹے حمزہ اور عمیر کی خدمت گزاری میں کوئی کمی نہیں آتی۔

میرا قیام بالائی منزل پر تھا۔ ہوا اور دھوپ کے لیے صحن کا حسب ضرورت استعمال ہوتا۔ کمرے سے منسلک کشادہ غسل خانہ گرم پانی، صابن اور تولیہ کے ساتھ، تکان اتارنے کی دعوت دیتا ہوا تحدیث نعمت کا نمونہ معلوم ہوتا۔ گلے میں خراش آجائے تو ملیٹھی اور گھریلو دوائیں موجود۔ نماز فجر کے لیے اٹھتا تو پھلوں کی ٹوکری سیب، سنترہ، کینو سے پُر سجی ہوتی اور ہر روز پھلوں کی کمیت اور نوعیت بدلتی رہتی۔ لذت کام و دہن سے فراغت ہوتی اور دواؤں کے استعمال کا وقت آتا تو خشک میووں اور چائے کی طشتری حاضر ہوجاتی اور کمالِ نفاست یہ ہے کہ پیالے سب کاغذ میں ملفوف ہوتے کہ طہارت اور حفظان صحت کی پاسداری میں کوئی کمی نہ آسکے۔

لاہور کے ہر پروگرام میں حافظ عبدالوحید روپڑی اپنی نفاست و سعادت مندی کے ساتھ موجود ہوتے۔ ناشتہ کی میز پر نیچے آتے تو اُن کے اصرار بلکہ خوشامد کی وجہ سے فرائی شدہ مچھلیوں کی چند قاشیں بخوشی تناول کرتے۔ زندہ دلانِ لاہور کو معلوم ہوا کہ مجھے ذیابیطس کی شکایت ہوگئی ہے اور مچھلی میری مرغوبات میں ویسے بھی سرفہرست ہے تو انھوں نے دل کھول کے میری تکریم کی۔

حافظ روپڑی کے اہلِ خانہ مجھے تو ولی معلوم ہوئے کہ اپنی ضروریات و ترجیحات اور آمد و رفت کے سارے پروگرام انھوں نے بالائے طاق رکھے یا اُن میں ضروری ترمیمات کیں کہ میری دل جوئی میں کوئی کمی نہ ہو۔ اعلیٰ درجے کی اس ضیافت پر انکسار، تواضع اور سعادت مندی کا ایسا اظہار کہ گویا زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں:

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا. (الدہر:۹)

ہم تمھیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کہتے ہیں کہ یہاں اطعام کا لفظ محدود معنی میں نہیں ہے۔ زندگی کی دوسری ناگزیر ضروریات کا اہتمام بھی اس میں شامل ہے۔ قرآن میں اطعام کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ آیت زیر بحث سے پہلے کے الفاظ بھی بڑے اہم ہیں:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ. (الدہر:۸)

وہ کھانا کھلاتے ہیں خود اس کے حاجت مند ہوتے ہوئے۔

مفسرین کرام نے عام طور پر عَلٰی حُبِّهِ کا ترجمہ ''اللہ کی محبت میں'' کیا ہے گویا ضمیر کا مرجع انھوں نے اللہ کو مانا ہے۔ مولانا اصلاحی اس کا مرجع لفظ طعام کو قرار دیتے ہیں اور مطلب یہ بتاتے ہیں کہ ابرار کا کردار یہ ہے کہ وہ خود ضرورت مند ہوتے ہیں لیکن اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ مولانا اصلاحی نے اس مفہوم کو ترجیح دینے کے حسبِ ذیل اسباب بتائے ہیں:

۱۔ قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں یہی مفہوم کھول کے بیان کیا گیا ہے:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ. (الحشر:۹)

وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود ضرورت مند ہوں۔

۲۔ آگے سورہ الدہر میں اللہ نے فرمایا ہے:

وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا. (الدہر:۱۲)

اور اُن کو اللہ نے اُن کے صبر کے صلے میں جنت اور حریر سے نوازا ہے۔

۳۔ بہترین انفاق وہی ہے کہ آدمی اپنے مطلوب مال میں سے اپنی ضرورت کو قربان کر کے اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرے۔

اللہ کرے کہ حافظ عبدالوحید روپڑی اور اُن کے اہلِ خانہ سورۃ الدہر میں بیان کردہ انعاماتِ الٰہی کے حقدار ٹھہریں جن کا تذکرہ اللہ رب العزت نے آگے کی آیات ۱۱-۲۱ میں کیا ہے اور آخر میں انھیں مژدہ سنایا جائے:

إِنَّ هَذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاء وَكَانَ سَعْيُكُم مَّشْكُوراً. (الدہر:۲۲)
یہ ہے تمہاری جزا اور تمہاری کارگزاری قابلِ قدر ٹھہری!

۵۴ مجلّات کا اشاریہ

ڈاکٹر شاہد حنیف نے تفصیل بتائی کہ اردو کے قدیم ۵۴ مجلّات ورسائل کا مکمل اشاریہ پچھلے بیس سالوں کی محنت شاقّہ کے بعد تیار کیا ہے۔ یہ اشاریہ ابھی آئن لائن دستیاب ہے۔ آٹھ ضخیم جلدوں میں بڑی تقطیع پر اسے شائع کرنے کا بھی منصوبہ ہے۔ اس کے بعد اگلا مرحلہ تمام ۵۴ رسائل کی مکمل عکس بندی کا ہے جسے PDF فارمیٹ میں تبدیل کرنا ہے۔

اشاریہ سازی کی ترتیب موضوعاتی بھی ہے اور مصنف کے اعتبار سے بھی۔ آگے چل کر ان تمام جلدوں کی طباعت بھی پیش نظر ہے۔ ڈاکٹر شاہد حنیف نے پیش کش کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تمام رسائل، مجلّہ علوم اسلامیہ، فکر ونظر، تہذیب الاخلاق اور علی گڑھ گزٹ کی اشاریہ سازی کے لیے وہ تیار ہیں اور اُن کی عکس بندی کے لیے بھی۔ تحریک علی گڑھ کی فکری وعلمی خدمات کو منظر عام پر لانے کا یہ ایک خوبصورت طریقہ ہے۔

میں انھیں علی گڑھ کے اربابِ بست وکشاد کے تجاہل کے بارے میں کیا بتاتا۔ میں اُنھیں کیسے کہتا کہ تحریک علی گڑھ کا استحصال کرنے والوں کی کمی نہیں ہے سیاسی مفادات کے لیے، جاہ ومنصب کے حصول کے لیے، ملازمت کی توسیع کے لیے۔ اربابِ علم وادب کتنی ریاضت کرتے ہیں، باہر والوں کو اس کی بھنک بھی نہیں لگتی۔ علم وادب کی خاطر ریاضت کرنے والے گمنامی کو ترجیح دیتے ہیں۔ عہدہ ومنصب سے دور رہتے ہیں۔ رابطے منقطع کر لیتے ہیں اور ان بے نام مجاہدوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔

حفیظ بے نوا کو کون جانے ہے کہ بیچارہ
نہ ایوانوں سے وابستہ، نہ دربانوں سے وابستہ

سرسید اکیڈمی نے مدتِ دراز کے بعد ابھی مقالاتِ سرسید از محمد اسماعیل پانی پتی ۱۰ جلدیں مشینی کتابت کے عمل سے گزار کر شائع کی ہیں۔ بقیہ جلدوں کی طباعت ابھی انتظار کے مرحلہ میں ہے۔ مشینی کتابت کے بعد قدیم سولہ جلدیں گیارہ جلدوں میں سمٹ گئی ہیں۔ یہ ایک بڑا کام ہے جو سرسید

اکیڈمی کر رہی ہے۔ اردو کے معروف کالم نگار کے رحمٰن نے غالباً ان مقالات کو شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تب سرسید اکیڈمی حرکت میں آ گئی۔ خدا کرے یہ علمی منصوبہ تکمیل کو پہنچے۔ میں نے اپنے احباب کو بتایا کہ نامور ادیب اور محقق اس اکیڈمی سے وابستہ رہے ہیں۔ پروفیسر عتیق احمد صدیقی، پروفیسر اصغر عباس، پروفیسر شان محمد اور اب پروفیسر علی محمد نقوی اس کے نگہبان ہیں۔

میں نے قرآن مجید کے کسی اشاریہ کا تذکرہ کیا تو ڈاکٹر شاہد حنیف نے بتایا کہ انگریزی میں لاہور ہی سے قرآنک تھیمٹک انڈکس شائع ہو چکی ہے، افسوس ہے کہ میں یہ انڈکس حاصل نہ کر سکا۔

قرآنی غذائیات پر تحقیق

۲۳ر نومبر ۲۰۲۲ء کی صبح حافظ عبدالوحید روپڑی کے فوری پڑوسی کے ہاں ناشتہ کا اہتمام تھا۔ وہ اپنے فکری و علمی اکتسابات پر گفتگو کرنا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر سخاوت علی Food and Biotechnology Research Center PCSIR Laboratories, Lahore کے سبک دوش افسر تھے۔ ان کا موضوع تحقیق تھا:

The Quran and Food یعنی قرآنی غذائیات۔

قرآن مجید میں انواع و اقسام کے کھانوں کا تذکرہ اور موجودہ سائنسی و زرعی تحقیقات کی جانب معجزانہ اشارات اور وہ بھی Power point presentation کی مدد سے۔ ایک گھنٹہ اُن کی گفتگو بڑی چشم کشا تھی۔ انھوں نے مختلف موضوعات کے تحت قرآن میں مذکور پانی، پھل، پودوں، مویشیوں سے متعلق آیات اور ان کے اردو ترجمے اور آج کی زرعی و ارضی تحقیقات جمع کر دی تھیں۔ اُن کی گفتگو کا ایک اہم موضوع تھا:

''قرآن مجید میں لفظ رزق کے استعمالات''

ایک گھنٹہ کی یہ مجلس بڑی ایمان افروز تھی۔ میں نے امید ظاہر کی کہ دینی مدارس میں آپ کے محاضرات کا اہتمام ہوگا اور قرآنی معجزات کے ایک نادر پہلو پر آپ کی گفتگو تمام مکاتب فکر کے حلقوں میں دلچسپی کا موضوع بنے گی۔ اگر انھیں آپ مربوط اور منظّم طریقے سے انگریزی میں مرتب کر لیں اور اسلام اور سائنس کے معیاری جرنل میں شائع ہو تو ترسیل بڑے پیمانے پر ہوگی۔

آج ساڑھے گیارہ بجے دارالہدیٰ میں حاضری کا پروگرام تھا۔ مولانا محمد رفیق نے یہ ادارہ تحفیظ وتجوید قرآن کے لیے قائم کیا جسے ان کے صاحب زادے محمد اسعد پرنسپل کی حیثیت سے چلا رہے ہیں۔ انھوں نے ایم بی اے کر رکھا ہے اور پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اسلامیات میں ایم اے بھی۔ اُن کے اساتذہ میں حافظ محمد عبداللہ بھی شامل ہیں جو ہمارے دور طالب علمی کے دوست ہیں۔ محمد اسعد نے اپنے استاذ گرامی کے ممتاز طریق تربیت اور تنبیہ کے متعدد واقعات سنائے۔

دارالہدیٰ میں حاضری کی تقریب حافظ عبدالوحید روپڑی کی دختر نیک اختر حفصہ وحید کی تکمیل حفظ قرآن کے وسیلہ سے ہوئی تھی۔ حفصہ کی والدہ اور خالہ بھی مٹھائی کے ٹوکروں کے ساتھ تشریف محفل تھیں۔

صدر شعبہ علوم اسلامیہ کی یتیمی

آج ڈھائی بجے یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور کے شعبہ علوم اسلامیہ کے صدر کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ مقصد بعض واجبات کی ادائیگی پر یونیورسٹی کو مہمیز کرنا تھا۔ حافظ روپڑی نے بتایا کہ صدر شعبہ سلفی ہیں اور میری اُن سے تمہیدی گفتگو ہو چکی ہے۔ وہ تعاون کے لیے تیار ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد شہباز حسن، صدر شعبہ علوم اسلامیہ کی پُرشکوہ تختی ان کی میز پر رکھی تھی۔ صورت سے بھی سطوت ہویدا تھی۔

ڈاکٹر محمد شہباز حسن تپاک سے ملے۔ چائے سے تواضع کی۔ مگر جب پی ایچ ڈی مقالات کے اکرامیہ کی ادائیگی کا تذکرہ ہوا تو یتیمی اور لاچاری کا اظہار کیا۔ میں نے غیرت دلائی تو علوم اسلامیہ کے شعبے کو یونیورسٹی انتظامیہ کے ذریعہ نظر انداز کیے جانے کا شکوہ کیا۔ میں نے چند جملے اور کبیدہ خاطر ہو کر بول دیے تو کہنے لگے: ''میں کرسئ صدارت سے استعفا دے دوں تو بھی انتظامیہ کے کانوں پر جوں تک نہ رینگے گی۔ وہ استعفا تو قبول کر لے گی مگر مقصد پورا نہ ہوگا۔''

کیا یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی کسی انتظامی افلاس کی شکار ہے یا اُس کا یہ نامعقول رویہ صرف علوم اسلامیہ کے شعبے کے ساتھ ہے؟ یا صدر شعبہ لاپروا قسم کے آدمی ہیں۔ باتیں بناتے ہیں مگر کام نہیں کرتے؟ یہ عقدہ آخر تک لاینحل ہی رہا۔

چلتے چلتے اپنی ایک تازہ تصنیف تحفے میں دی: صحاحِ ستہ کی مشترکہ احادیث سے ماخوذ ''دینِ اسلام کے معروف اور اہم بنیادی احکام ومسائل''

بڑی تقطیع پر ۵۰۴ صفحات میں پھیلی ہوئی اس کتاب میں جو ۲۰۲۲ء میں طبع ہوئی ہے، سلفی رجحان کی مضبوط اور معتدل نمائندگی مفقود ہے۔ صاحبِ تصنیف نے مسجدوں میں خواتین کی حاضری کو جائز کہا ہے جو حالات کے دباؤ کا اثر ہے۔ انھیں اس عمل کو 'مسنون' کہنا چاہیے تھا جس میں علمائے دین کے درمیان بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مسجدوں میں دورِ رسالت میں خواتین کی حاضری کے جواز میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے مگر صحیحین کی متفق علیہ حدیث کی روشنی میں اسے مسنون کہنا زیادہ موزوں تھا۔

غیر منقوط تفسیری ترجمہ

پروفیسر طاہرہ بشارت شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے چار سال پہلے سبک دوش ہوچکی ہیں تب سے وہ ایک پرائیویٹ مگر معروف ومعتبر دانش گاہ یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹکنالوجی لاہور کے شعبہ اسلامی فکر وتہذیب سے وابستہ ہیں۔ جماعت اسلامی کے معروف اور ہر دل عزیز رہنما اور مصنف خرم مرادؒ کے فاضل صاحب زادے ڈاکٹر صہیب حسن مراد اس کے منتظم اعلیٰ ہیں۔

پروفیسر طاہرہ بشارت سے راہ ورسم پرانی ہے۔ اُن سے ملاقات پروگرام میں شامل تھی۔ ہم حافظ عبدالوحید روپڑی کی رفاقت میں کیمپس پہنچے تو طلبہ وطالبات کی پرہجوم موجودگی تدریسی وتحقیقی سرگرمیوں کا ثبوت فراہم کررہی تھی۔ پروفیسر بشارت نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک غیر رسمی مگر علمی نشست کا انتظام کرلیا۔ اردو زبان میں غیر منقوط ترجمۂ قرآن کا مقدس حوالہ کافی تھا۔

عربی زبان میں غیر منقوط تفسیر **سواطع الالھام** کا تذکرہ تو ہم نے پڑھا تھا۔ یہ مغل حکمراں جلال الدین اکبر کے درباری عالم ابوالفیض فیضی (۱۰۰۴-۹۵۴ء) کی شاہ کار سمجھی جاتی ہے۔ بڑی تقطیع میں سات سو صفحات پر مشتمل بغیر کسی نقطہ والے حرف کو استعمال کیے فاضل مفسر کی خداداد قابلیت کا بھرپور اظہار ہے مگر مفسر نے کتنی مشکل زبان استعمال کی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ کسی سورہ کو مدنی بتانے کے لیے وہ حسبِ ذیل جملہ لکھتے ہیں:

موردها مصر رسول اللّٰہ صلعم

اور مکی سورہ کی نشاندہی اس طرح کرتے ہیں:

موردُها اُمّ الرّحم

مگر آج اردو زبان میں غیر منقوط ترجمۂ قرآن کی زیارت ہوئی۔ اس کا نام ہے:

''درس کلام اللہ''

فاضل مترجم ہیں ڈاکٹر محمد طاہر مصطفیٰ، ڈائرکٹر سیرت چیئر، یونیورسٹی آف منیجمنٹ اینڈ ٹکنالوجی لاہور۔ تزئین وادارت کی ذمہ داری نبھائی ہے حافظ محمد عدنان بشیر نے۔ مجھے فاضل مترجم نے طبع دوم ۲۰۲۲ء کا نسخہ ہدیہ کیا۔ المصباح ناشرانِ قرآن وکتب اسلامی اردو بازار نے اسے اہتمام وافتخار سے شائع کیا ہے۔ ۱۴۲۲ صفحات پر مشتمل اس سعادتِ عظمیٰ کا آغاز ہوا ۱۴ رمئی ۲۰۱۱ء سے اور اس کی تکمیل ہوئی ۳۰ رمئی ۲۰۱۳ء کو۔

فاضل مترجم نے مولانا محمد بن ابراہیم جونا گڑھیؒ (۱۹۴۱-۱۸۹۰ء) کا منقوط ترجمہ بھی اس میں شامل کیا ہے۔ غالباً عام قارئین کی آسانی کے لیے ایسا کیا گیا۔ اُن کے دادا مجلس احرار سے وابستہ تھے۔ فاضل مترجم نے اس کاوش کو اردو زبان میں قرآن کریم کا پہلا غیر منقوط تفسیری ترجمہ قرار دیا ہے اور اس کی وجہ مقدمہ میں اس طرح بیان کی ہے:

> ''اس ترجمہ کو علماء کے مشورے سے اب تفسیری ترجمہ کہنے کا بھی مدعا یہی ہے کہ ترجمے میں کلام کے ہر لفظ کو دوسری زبان میں ڈھالا جاسکتا ہے مگر یہاں میں عرض کروں کہ کلام اللہ کے ہر لفظ کو غیر منقوط الفاظ میں نہیں ڈھالا گیا بلکہ اجمالی مفہوم کو ڈھالا گیا ہے اور اس مفہوم میں کہیں الفاظ کم یا زیادہ بھی نظر آئیں گے۔ لہٰذا الفاظ کم یا زیادہ ہونے کی رعایت تفسیر میں تو ہوسکتی ہے، ترجمے میں نہیں۔ اسی لیے اسے غیر منقوط تفسیری ترجمہ کہا گیا ہے اور تفسیر تفصیلاً بھی ہوتی ہے اور مختصر سے مختصر بھی۔ غیر منقوط تفسیری ترجمے کے دوران ناموں کو (شیڈ دے کر) اُسی طرح منقوط تراکیب میں برقرار رکھا گیا ہے کیوں کہ ناموں کا نعم البدل نہیں ہوتا۔''

سورۃ البقرہ آیات ۱ تا ۷ کا غیر منقوط ترجمہ ڈاکٹر محمد طاہر مصطفیٰ کے معجز نما قلم سے ملاحظہ کیجیے۔ دیکھئے وادیٔ پُر خار کو انھوں نے کتنی ریاضتوں اور سعادتوں سے طے کیا ہے:

''الٓمٓ، وہ لکھا ہوا مراسلہ، ماوراء ہے معمولی سے معمولی وہم اور وسوسے سے۔ راہ دکھائے اللہ سے ڈرے ہوئے لوگوں کو۔ وہ لوگ کہ دھرم لائے لُکے ہوئے عالم کا اور دائمی طور عامل ہوئے صلوۃ کے اور ہمارے عطا کردہ مال سے (اللہ) کی راہ دے کر مامور ہوئے (دُکھی لوگوں کی مدد کے واسطے) اور وہ لوگ حامی ہوئے اس کے کہ مُرسل ہوا (محمدؐ) اور اُس سے اول کے رسولوں کے واسطے اور دل سے حامی ہوئے عالمِ معاد کے۔ سو وہی لوگ ہوئے اللہ کے ہاں سے راہِ ہدیٰ والے اور وہی ہوئے کام گار۔ ہاں وہ لوگ کہ ہو گئے ملحد، اس طرح کے لوگوں کو ڈراؤ کہ مکالمہ روک لو، وہ اللہ اور اُس کے رسول کے عدمِ حامی ہی ہوں گے۔ مُہر کر ڈالے گئے اللہ کے ہاں سے اِس طرح کے لوگوں کے دل اور سماع، اور وہ محروم کر ڈالے گئے دکھائی سے اور اِس طرح کے لوگوں کے واسطے گہرا صدمہ اور آلام ہوگا۔'' (البقرہ: ۷-۱)

سن رسیدگی کا دماغی کھیل

رسمی نشست تکمیل کو پہنچی۔ اس دوران ڈاکٹر محمد طاہر مصطفیٰ نے دفتر کے ایک ملازم کی خدمات حاصل کیں اور دفتر مالیات سے رابطہ ہو گیا۔ طاہرہ بشارت ہشاش بشاش سن رسیدگی کو مات دینے میں کامیاب تھیں۔ اللہ نے انھیں غم روزگار سے رست گاری نصیب کی ہے اور زندگی جینے کا ہنر وہ جانتی ہیں۔ کہنے لگیں:

''ایک بار ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے اسٹیج سے کرسی پر بیٹھ کر ہی خطاب کیا۔ میں نے عرض کیا: ڈاکٹر صاحب! آواز بہت نحیف تھی۔ آپ کی بات ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آئی۔ بولے: میری عمر کو پہنچو گی تو کھڑے ہونے کی سکت نہ ہوگی۔

کہنے لگیں: ''بچے سعادت مند ہیں۔عمر کا پتہ ہی نہیں چلنے دیتے۔ بیٹی مریم نے اپنی ایک دوست کو جھڑک دیا: میرے والدین کی عمر ساٹھ سے زیادہ ہوچکی ہے۔ میں ہوسٹل afford نہیں کرسکتی۔اور پھر اُس دوست سے قطعِ تعلق کرلیا۔''

میں نے ابھی چند روز پہلے انگریزی روزنامہ دی ہندو کی ۱۵؍جنوری ۲۰۲۳ء کی اشاعت میں ایک خوبصورت تحریر پڑھی:

Ageing is a mind game by Tiny Nair (tinynair@gmail.com)

مضمون نگار کا تجزیہ یہ ہے کہ بزرگی اور سن رسیدگی کی تعریف اب تبدیل ہوگئی ہے۔۶۵ سال سے ماوراہر شخص بوڑھا نہیں ہوتا۔۶۵ سے ۷۵ سال تک کی عمر کے درمیان کے لوگ ''نوجوان بوڑھے (Young Old) ہوتے ہیں۔ ۷۵ سے ۸۵ کی درمیانی عمر انسان کو ''متوسط بڑھاپے (Middle Old) میں داخل کرتی ہے اور جو ۸۵ سے تجاوز کر جائیں وہ سن رسیدہ بوڑھے (Older Old) ہوجاتے ہیں۔ جاپان جیسے ممالک میں 'سن رسیدہ بوڑھے بھی تندرست نظر آتے ہیں۔سن رسیدگی سے صحت لازمی طور پر برباد نہیں ہوتی۔ جو لوگ متحرک اور پُر جوش ہوتے ہیں وہ اپنی کارکردگی اور ذہنی وفکری توانائی سے سن رسیدگی میں بھی انسانیت کو فیض یاب کرتے ہیں۔مضمون نگار نے بطورِ ثبوت تین مثالیں پیش کیں:

۱۔ Richard Dawkins (ماہر حیاتیات) عمر ۸۲ سال

۲۔ Denial Kahneman (مفکر) عمر ۸۸ سال

۳۔ Noam Chomsky (لسانیات کا ماہر) عمر ۹۱ سال

چنانچہ اب تحقیق کاروں نے نقاہت اور ضعف (Frailty) کا ایک نیا تصور دیا ہے۔اس میں اجتماع ہے درج ذیل نقائص کا: نقل وحرکت میں دشواری، سست حافظہ اور کمزور سوچ، اعضا، اعصاب اور ہڈیوں میں کمزوری اور روزمرہ کے معمولات کی انجام دہی میں مشکلات۔ تحقیق بتاتی ہے کہ ۶۵ سے ۷۵ سال کی عمر والے افراد صرف دس فیصد Frailty کا شکار ہوتے ہیں جبکہ ۸۵ سال سے تجاوز کر جانے والے افراد میں اس کی شرح ۲۵ فیصد بڑھ جاتی ہے۔

۲۰۲۱ء میں جانسن ہاپکنس یونیورسٹی میں چار ہزار آٹھ سو مریضوں پر ایک ریسرچ ہوئی۔

The US National Health and Ageing Trend Study نے بڑی مہارت سے تحقیق کی۔ وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ تکریم نفس اور تفکیر نفس کی رفتار جن لوگوں میں سست ہوتی ہے اُن میں نقاہت اور ضعف کا خطرہ ۴۱ فیصد زیادہ ہوتا ہے۔ اپنی صحت اور قوت کی ذمہ داری زیادہ تر انسان کے خود اپنے رویے، سوچ اور ذہنیت پر ہوتی ہے۔ مضمون نگار نے آخر میں ٹام ہاپکنس (Tom Hopkins) کا ماہرانہ مشورہ نقل کیا ہے:

> You are your greatest asset. Put your time, effort and money in grooming yourself 'Not for others to appreciate , but for your health'.
>
> ''آپ کا سب سے قیمتی اثاثہ آپ کی اپنی ذات ہے۔ اپنا وقت، اپنی سعی اور اپنا پیسہ اپنی شخصیت کی تزئین میں صرف کیجیے۔'' اس لیے نہیں کہ دوسرے تعریف وتحسین کریں بلکہ خود اپنی صحت کے لیے۔

پروفیسر طاہرہ بشارت کو تبریک کہ دین داری کے ساتھ صحت وعافیت کی فکرمندی کو اپنا وظیفہ حیات بنایا، زندگی جینے کا سلیقہ سیکھا اور دوسری خواتین کے لیے ماڈل بنیں۔

کتب خانۂ سیرت لاہور میں حاضری

جناب حسّان عارف محبت کرتے ہیں اور وہ بھی بے لوث۔ کئی دنوں سے تاک میں تھے اپنی محبتوں کے ڈونگرے برسانے کے لیے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک بے علم وادب استاذ کو جسے اپنی فکری سطوت کا دعویٰ ہے نہ علمی طنطنہ کا کوئی خمار، پھر بھی لوگ اسے کج کلاہ سمجھتے ہیں، تو محض تو قیر علم اور ضیائے دین کی برکت سے وہ نوازشوں اور عطایا کا حق دار سمجھتے تھے۔ آخر کار ۲۴ نومبر ۲۰۲۲ء کی صبح گیارہ بجے کا وقت اُن کے لیے فارغ کیا گیا۔ ویسے بھی آج کا دن بڑا مصروف تھا۔

''توضیحات فکر فراہی'' جلد دوم کا ایک نسخہ میرے حوالے کیا۔ اپنے والد مرحوم خالد مسعودؒ سے بے پناہ عقیدت جو رکھتے ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ آپ یہ تحفہ مجھے عنایت کر چکے ہیں۔ میں نے اسالیب قرآن کی پوری بحث دیکھ لی ہے۔ فکر فراہیؒ کی خوبصورت توضیح تقریباً تیس صفحات پر مشتمل

ہے۔ کہنے لگے: اس کی اشاعتِ دوم کی تیاری ہورہی ہے۔ شیخ زائد اسلامک سینٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور میں جو علمی تقریب ہوئی تھی اُس میں آپ کی گفتگو بڑی مؤثر تھی۔ سوالات کا آپ نے جواب بڑا متوازن دیا تھا۔ بس اُسی دن سے یہ خواہش جاگ اٹھی کہ ''توضیحات فکر فراہیؒ'' جلد دوم پر مقدمہ آپ تحریر کریں۔

میں نے عرض کیا: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی نے اگست ۲۰۰۰ء میں فکر فراہی کی تشریح کی خاطر میری بھی ایک کتاب شائع کی تھی جس کا عنوان تھا: ''قرآن مبین کے ادبی اسالیب۔'' یہ بنیادی طور سے تخصص فی التفسیر کے لیے لکھا گیا وہ مقالہ تھا جو جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڑھ میں ۱۹۸۰ء میں جمع کیا گیا تھا۔ یہ مقالہ استاد گرامی مولانا نظام الدین اصلاحیؒ (۲۰۲۲-۱۹۲۸ء) کی قانونی نگرانی میں مرتب ہوا تھا مگر مولانا جلیل احسن ندویؒ (۱۹۸۱-۱۹۱۳ء) سے براہِ راست استفادے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ (۲۰۲۰-۱۹۲۸ء) کی صدارت کا یہ تیسرا دور تھا۔

جناب حسّان عارف گاڑی خود ڈرائیو کررہے تھے۔ منزل مقصود آ گئی۔ کتب خانۂ سیرت لاہور کی زیارت کا پروگرام تھا اور ظہرانے کا بھی۔ تھوڑی دیر میں حافظ عبدالوحید روپڑی بھی اپنے تجارتی امور نمٹا کر آ گئے۔ یہ عظیم الشان ذخیرۂ سیرت اپنی خوبصورت اور کشادہ عمارت میں ہر زائر کو متحیر کردینے والا ہے اور کمال یہ ہے کہ ایک تعمیراتی کمپنی کرافٹ کون پرائیویٹ لمٹیڈ کے مالک جناب چودھری رؤف احمد کی نفاستوں اور سعادتوں کا مظہر ہے۔ اس کتب خانہ میں پندرہ ہزار چارسو پینتالیس نادر کتابیں اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں میں موجود ہیں۔

عنایت رسول چڑیا کوٹی کی معروف زمانہ سیرت پر کتاب ''بشریٰ'' یہاں موجود تھی۔ ناظم کتب خانہ ڈاکٹر ضیاء الحق قمر سے استصواب کیا تو میری متعدد نگارشات اور مدون شدہ مجموعۂ مقالات یہاں موجود تھے۔ ذکرِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، فکرِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، عشق محمد صلی اللہ علیہ وسلم، خطبات احمدیہ کا مطالعہ، ہندوستان میں اردو سیرت نگاری، شعبہ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سیرت نگاری، یہ ساری کتابیں قرینے سے الماریوں کی زینت تھیں۔ ڈاکٹر ضیاء الحق قمر نے تحفہ میں ایک کتاب عنایت کی:

''معارف سیرت'' (ماہنامہ معارف اعظم گڑھ سے منتخب مقالاتِ سیرت) ترتیب: میاں محمد

سعد خالد، اہتمام: حافظ محمد ندیم، دارالکتاب ناشران وتاجران، یوسف مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ لاہور (اپریل ۲۰۲۱ء) صفحات ۵۸۱۔

دینی ادبیات کے تشنہ پہلو

۲۴ر نومبر ۲۰۲۲ء ہی کو ادارہ معارف اسلامی کے سربراہوں اور کارکنان سے ملاقات تین بجے طے تھی۔ میری بے تکلفی اور قربت اس ادارہ سے قدیم ہے۔ دینی کتابوں کی اشاعت اور تحقیق اس کی ترجیحات ہیں۔ اب اس کے ڈائرکٹر حافظ ساجد انور ہیں اور اس کے قدیم ترین کارکن محمد انور گوندل جنرل سکریٹری۔ میری تین کتابیں یہاں سے شائع ہوچکی ہیں:

۱۔ تاریخ دعوت و جہاد- برصغیر کے تناظر میں، طباعت سوم، اگست ۲۰۰۰ء

۲۔ فکر اسلامی کا بحران (ڈاکٹر عبدالحمید احمد ابوسلیمان کی عربی کتاب **أزمة العقل المسلم** کا اردو ترجمہ) اکتوبر ۲۰۰۱ء۔ دیباچہ محمد اسلم سلیمی ڈائرکٹر کا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو 'ایک معقول اور عالمانہ جوابی ردِّعمل' قرار دیا ہے جو بیسویں صدی کے 'جذباتی ردِّعمل' پر کیا گیا ہے۔

۳۔ اسلام کی بنیادیں (حسن ایوب کی عربی کتاب **تبسیط العقائد الاسلامیة** کا اردو ترجمہ): ڈائرکٹر ادارہ معارف اسلامی نے اس کتاب کو شائع کرتے وقت 'اسلامی فرقوں' کے باب سے قادیانیت کی بحث کو نکال دیا تھا، غالباً حکومت پاکستان کے قانون کے پیش نظر، جس میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا۔

کارکنان اور سربراہوں سے ملاقات کے بعد تاثر ہوا کہ اس سے قبل محمد اسلم سلیمی مرحوم زیادہ فعال، متدین اور صاحبِ علم ڈائرکٹر تھے۔ آج کی نشست میں باہمی تعارف ہوا۔ سید مودودیؒ اور سید قطبؒ کی کتابوں کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شعبہ علوم اسلامیہ کے نصابِ درس و تحقیق سے خارج کیے جانے کی خبروں پر خلجان تھا۔ میں نے انھیں اطمینان دلایا کہ اس طرح کے اقدامات بورڈ آف اسٹڈیز اور اکیڈمک کونسل کے اجتماعی فیصلوں کا مرہون ہوتے ہیں۔ صدر شعبہ کی نافہمی اور نامعقول بیانات شعبہ اور اس دانش گاہ کی ہواخیزی کا سبب بنے، ورنہ پہاڑ تو کجارائی برابر بھی اس خبر میں صداقت نہ تھی۔

ہندو پاک میں شائع ہونے والی کتابوں کے ناقص اور تشنہ پہلوؤں پر طویل گفتگو ہوئی۔ اس سیاق میں دینی ادب میں درج ذیل پہلوؤں پر تحقیق اور ان کی نشر و اشاعت پر میں نے زور دیا:

۱۔ غیر مسلموں سے انسانیت نواز تعامل، جس میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار نمایاں ہو۔

۲۔ تکثیری معاشرہ کے مسلمانوں کے لیے ملک کی تعمیر و ترقی میں برابر حصہ داری نبھانے والا بیانیہ۔

۳۔ عہد رسالت میں خواتین کی آزادی و شراکت کی بعینہٖ واپسی۔

۴۔ فقہی مسالک کے بڑھتے اختلافات کا سدّ باب اور تکفیر و تشدد کے رجحانات کا استیصال

یہ وہ موضوعات ہیں جن پر علمائے دین، اسلامی جماعتوں اور دین پسند مصنفین کا ذہن واضح نہیں ہے۔ برسوں کے جمے جمائے گرد و غبار سے اسلامی فکر کی شبیہ دھندلی ہوگئی ہے۔ ضرورت ہے کہ عصری تعبیرات میں نیا بیانیہ فراہم کیا جائے جس کی جڑیں قرآن و سنت کے نصوص میں پیوست ہوں۔

مستشرق کے جواب میں مستغرب

۲۴ر نومبر ۲۰۲۲ء کو یہ تیسرا علمی مذاکرہ تھا۔ منصورہ کے آڈیٹوریم میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے طلبہ و اساتذہ اور تحریک اسلامی کے قافلہ سالاروں کا یہ اجتماع، بقول محمد ایوب منیر، مجھے خوش قسمتی سے خطاب کے لیے میسر تھا۔ طلبہ اور نوجوانوں سے گفتگو کے لیے موضوع دیا گیا تھا۔ ''احیائے اسلام کا مستقبل اور اس کے علمی تقاضے۔'' ناظم اجلاس حافظ محمد اسرار تھے اور صدارت کر رہے تھے ادارہ معارف اسلامی کے سابق مدیر حافظ محمد ادریس جو متعدد کتابوں کے مترجم و مصنف ہیں۔ ''رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم تلواروں کے سایے میں'' اُن کی مقبول عام کتاب ہے، **اخوان المسلمون** (مصر) کے مرشد عام السید عمر تلمسانیؒ (۱۹۸۶-۱۹۰۴ء) کی عربی خودنوشت کا سلیس اور خوبصورت اردو ترجمہ بھی آپ کے حسنات میں شامل ہے۔ اس کا عنوان ہے: ''یادوں کی امانت'' (**الشرق الاوسط** میں عصام الغازی کے ذریعہ لیے گئے انٹرویو کی سلسلہ وار قسطیں) البدر پبلی کیشنز لاہور (۱۹۸۶ء۔

محمد ایوب منیر ہمدم دیرینہ ہیں اور تحریک اسلامی کے مخلص خادم۔ اُن کی بات درست تھی۔ ایک جید عالم و مصنف کی صدارت میں گفتگو کا موقع واقعی نعمت عظمیٰ تھا۔ میں نے اپنی گفتگو میں درج ذیل

نکات پر زور دیا:

۱۔ علمی و تحقیقی احسان اور دیانت دارانہ فکری تعامل

۲۔ اسلاف کے ورثہ سے مجتہدانہ استفادہ، تقلید اعمٰی سے کلّی اجتناب

۳۔ مغرب پر علمی و فکری تنقید

۴۔ عربی زبان و ادب کے ساتھ مغرب کی ایک زبان پر تبحر

۵۔ اسلامی کردار جس پر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اثرات نمایاں ہوں

میں نے بطور خاص زور دیا کہ مستشرقین کا علمی و فکری جواب دینے کے لیے مستغربین کی ضرورت ہے۔ ایسے اصحاب علم و دانش کی کھیپ جو مغربی فکر و فلسفہ پر عبور حاصل کرے اور پھر اسلامی نظام حیات کی ترجمانی کرے۔ میں نے محمد اقبال (۱۹۳۸-۱۸۷۶ء) مریم جمیلہ (۱۹۳۴ء)، علی عزت بیگووچ (۲۰۰۳-۱۹۲۵ء) اور فواد سیزگین (۲۰۱۸-۱۹۲۴ء) کے علمی اکتسابات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ سوالات زیادہ تر طلبہ کی جانب سے ہوئے:

''کیا احیائے اسلام میں حصہ داری کے لیے کسی تنظیم سے عملی وابستگی ضروری ہے؟

بالکل نہیں۔ تنظیموں کا مقصد تو امت اسلامی کو احیائے دین کے لیے تیار کرنا ہے۔ مگر کوئی تنظیم دین کے احیا و تجدید کے لیے جدوجہد کر رہی ہو تو ہم اُس سے لاتعلق نہیں رہ سکتے۔ ہمارا تعاون، ہماری دعائیں اور ہمارے جذبات ایسی تحریکوں کے ساتھ وابستہ ہوں جو اصلاح و تجدید کا کام کر رہی ہوں۔''

میرا واضح جواب تھا۔

ایک دوسرے طالب علم نے وضاحت چاہی:

''کسی فرد کے پاس وسائل نہ ہوں تو احیائے اسلام کی مہم میں وہ حصہ داری کیسے نبھائے۔''

میرا جواب فی البدیہ تھا:

''اسلام پر خود عمل کرے اور تحریک احیائے اسلام کے لیے دعا گو ہو۔ اللہ

نیتوں کو دیکھتا ہے اور کسی شخص پر اُس کی قوت واستطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔''

''ہمارے دینی ادب میں حقوقِ خواتین سے متعلق آپ کو کیا نقص نظر آتا ہے؟'' ایک بزرگ تحریکی ساتھی نے استفسار کیا۔

''وہ عہدِ رسالت کی آزادی، حقوق اور تکریم نسواں کا صحیح ترجمان نہیں ہے۔ اس ادب پر فتنہ اور سدِ باب کے خودتراشیدہ اصولوں کا زیادہ اثر ہے۔ ہمارے لٹریچر کو دورِ رسالت کی طرف واپس لانے کی ضرورت ہے۔'' میرا جواب دوٹوک تھا۔

ادارہ معارف اسلامی نے اپنی حسبِ ذیل کتابیں تحفہ میں عنایت کیں:

۱۔ اسوۂ حسنہ (چند اصولی اور فکری پہلوؤں کا جائزہ) ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی (جون ۲۰۲۲ء)

۲۔ شان صحابہ، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ترتیب مولانا عبدالرحیم چترالی (جون ۲۰۲۲ء)

۳۔ اسلام اور مشرق ومغرب کی تہذیبی کشمکش، علی عزت بیگووچ، مترجم محمد ایوب منیر، اشاعت چہارم (جنوری ۲۰۲۰ء)

۴۔ خاندانیت (Familism) ڈاکٹر سمیحہ راحیل قاضی، صفحات ۶۲۶ (اگست ۲۰۲۲ء) دوسرا حصہ ''خاندان اور عصر حاضر کے تقاضے'' ابھی طبع نہیں ہوسکا ہے۔

۵۔ محمد اکرم طاہر (۲۰۲۱-۱۹۴۶ء) کی انگریزی کتاب جو محمد ایوب منیر کی خاص کرم فرمائی کا نتیجہ ہے: The Last Prophet Muhammad and the West یہ کتاب ۲۰۱۴ء میں ''محمد رسول اللہ- مستشرقین کے خیالات کا تجزیہ'' کے نام سے اردو میں شائع ہوئی تھی۔ انگریزی اشاعت میں کافی اضافے ہیں۔ ۲۰۲۱ء میں ۴۹۹ صفحات پر مشتمل یہ کتاب The Success Designers Lahore نے شائع کی ہے۔

۶۔ ماہنامہ خواتین میگزین لاہور کی اشاعت خاص: ''سفیرِ امت- عبدالغفار عزیزؒ (وفات: ۵/اکتوبر ۲۰۲۰ء) خصوصی ادارت: عباس اختر اعوان۔

اس اشاعت میں مولانا مسعود عالم ندویؒ (وفات: ۱۶/مارچ ۱۹۵۴ء)، عاصم الحدّادؒ

(وفات: ۱۱؍اپریل ۱۹۸۹ء)، مولانا خلیل احمد الحامدیؒ (وفات: ۲۵؍نومبر ۱۹۹۴ء) اور چودھری غلام محمدؒ (وفات: ۲۹؍جنوری ۱۹۷۰ء) جیسے اکابرین تحریک اسلامی کا تذکرہ بھی پروفیسر خورشید احمد کے مضمون میں موجود ہے۔

نظریاتی رسوخ کے ساتھ لچک دار حکمت عملی

آج ۲۵؍نومبر کو ڈاکٹر سخاوت علی نے پھر کرم کیا۔ حافظ عبدالوحید روپڑی کے مہمان کی تکریم پیش نظر تھی۔ فوری پڑوسی تھی اور غذائیات قرآن کے عالم سائنس داں۔ آج انھوں نے روہو مچھلی سے ضیافت کی۔

نماز جمعہ کا خطبہ مسجد رحمانی میں حافظ روپڑی کے حکم کی تعمیل میں راقم نے دیا۔ سورہ المؤمنون کی ابتدائی آیات کے حوالے سے مسلمانوں کی مطلوبہ صفات پر گفتگو کا موضوع تھا: (۱) نمازوں میں خشوع وخضوع کا اہتمام اور اُن کی حفاظت ونگہداشت (۲) لغویات سے مکمل اجتناب (۳) زکوٰۃ کی منظّم ادائیگی (۴) شہوت اور بدکاری کا سدّ باب (۵) امانتوں اور عہد کا مکمل پاس ولحاظ۔

یہ صفات جمع ہوجائیں تو قرآن فلاح وسعادت کی ضمانت دیتا ہے۔

۲۴؍نومبر ۲۰۲۲ء کو عمیر وحید روپڑی نے حفظ قرآن مکمل کیا تھا۔ آج مسجد رحمانی میں اُن کے آخری سبق کی سماعت ہوئی۔ تین بجے رحمانی اکیڈمی آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی لاہور کے اساتذہ سے ملاقات کا پروگرام تھا۔ مجھے موضوع دیا گیا تھا: ''علمائے قدیم وجدید کا تقارب- منہج اور حجابات۔'' میں نے موقع کو غنیمت جان کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے برج کورس اور بیدر کرناٹک کے ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ان کے ادارہ Shaheen Group of Institutions کا تعارف بھی پیش کیا۔ بات آگے بڑھی تو ڈاکٹر سیف اللہ فیضی کے سوال پر میں نے اپنی ایک کتاب کا حوالہ دیا: ''تشدد یا دعوت ومصابرت''، پبلی کیشنز ڈویژن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (۲۰۱۸ء) صفحات ۳۰۰۔ اس کتاب کا چھٹا باب ''تعلیمی اداروں کا فکری افلاس'' ان ہی موضوعات سے بحث کرتا ہے۔

میری گفتگو منہج پر خاص طور سے تھی۔ نظریاتی اور فکری رسوخ ضرور ہو مگر حکمت عملی میں لچک ہو۔ ایمانیات میں کوئی مداہنت نہ ہو مگر طریقہ کار میں حکمت وفراست کی بھرپور رعایت ہو۔

رحمانی اکیڈمی آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی دراصل حفاظِ قرآن کی نگہداشت کے ساتھ انھیں میٹرک کا امتحان بھی دلاتی ہے تاکہ ملک کی قیادت جن نوجوانوں کے ہاتھ میں آئے وہ حافظِ قرآن بھی ہوں اور جدید علوم سے آراستہ بھی۔

پروفیسر محمد عبداللہ کی صالحیت

مہمان خانہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے مطبخ میں آج عشائیہ تھا۔ پروفیسر محمد عبداللہ میزبان تھے۔ پتہ نہیں اُن کے نام کے ساتھ صالح کا لاحقہ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے کیسے لگایا تھا۔ ایک بار میری بحث ہوگئی:

> ''آپ کو غلط فہمی ہورہی ہے۔ اُن کا نام محمد عبداللہ ہی ہے۔ دعوۃ اکیڈمی اسلام آباد کے سہ ماہی انگریزی جرنل Quarterly Insights کے ایڈیٹر عبدالرحمٰن صالح ہیں۔ آپ کو ضرور التباس ہوگیا ہے۔''

پروفیسر صدیقی گویا ہوئے:

> ''آپ نے تواتر سے لاہور کا سفر متعدد بار کیا ہے۔ ہر سفر میں ڈاکٹر عبداللہ کی صالحیت کیا آپ کو روز افزوں محسوس نہیں ہوئی؟ ہمارے ہاں ایک ملازم جو مستقل ہوجاتا ہے خواہ چپراسی ہو، کیسے اکڑ کے چلتا ہے جیسے اُس کے آبا واجداد کا شجرہ فرعونِ مصر سے ملتا ہو! بھئی اُن کے والدین کو غیب کا علم نہیں تھا ورنہ وہ صالح کا لاحقہ ضرور لگاتے۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ صالح کے بغیر اُن کا نام ادھورا ہے۔''

اور میں اُن کے التباس و تلبیس کا حصہ خود بن گیا۔ جتنا غور کیا محمد عبداللہ کی صالحیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ آج اُن کے بیٹے حسین بھی ہم رکاب تھے۔ سوشل میڈیا پر ادبی و علمی شطحات اُن کے معمول کا حصہ ہیں۔ وہ اسلامی جمعیت طلبہ کے رکن بھی ہیں۔ حافظ روپڑی کی قیادت میں ڈاکٹر سیف اللہ فیضی اور ڈاکٹر منیر احمد رسول پوری بھی مہمان تھے مگر مہمان خانہ کا ویٹر بدتمیز بھی تھا اور بد اخلاق بھی۔ ہمیں میز سے اٹھ جانے کا حکم دیا کہ بکنگ کسی اور فرد کے لیے تھی۔ ہماری بکنگ کی اسے

اطلاع ہی نہ تھی۔

پروفیسر محمد عبداللہ کی آمد ہوگئی تب بھی ہمیں انتظار کرنا پڑا۔ عشائیہ کا لطف واپس لانے کے لیے کافی طویل گفتگو ہمارا مقدر تھی۔ اُن کی نگرانی میں مولانا سلطان احمد اصلاحیؒ کی خدمات پر ایک ایم فل ہوگئی ہے اور مولانا محمد یوسف اصلاحیؒ کے افکار وعطایا پر ایک ڈاکٹریٹ کا مقالہ تیار ہو رہا ہے۔ مولانا سید جلال الدین عمریؒ (۲۰۲۲-۱۹۳۵ء) کے افکار پر بطور خاص ماہر نسائیات اسلامی ایک پی ایچ ڈی کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

عشائیہ تکمیل کو پہنچا تو گاجر کے حلوے کی سوغات بھی پیش ہوئی۔ حافظ عبدالوحید روپڑی نے بطور مزاح ویٹر کو پیشگی معافی نامہ عطا کر دیا۔ میزبان نے اُس کی تہدید کی تو وہ معافی تلافی پر آ گیا۔ ایک پیالہ حلوہ کی ضیافت بڑھ گئی۔ اب تو حافظ روپڑی نے معافی کو یقینی بنا دیا۔ میں نے عرض کیا: ہماری یونیورسٹی کے ملازم بڑے باادب اور ملنسار ہوتے ہیں۔ یہ زندگی کا پہلا تجربہ ہے۔

علم کے ساتھ حلم اور تحمل

۲۶ نومبر ۲۰۲۲ء کو جامعہ اہل حدیث لاہور کی زیارت صبح سات بجے مقدر تھی۔ اس نامور تعلیمی ادارے میں حاضری کسی سعادت سے کم نہ تھی۔ محدث روپڑی اکیڈمی بھی اسی عمارت میں واقع ہے۔ جامع القدس کے نام سے ایک وسیع مسجد بھی آباد ہے۔ مجھے خطاب کرنا تھا طلبہ واساتذہ سے۔ میں نے موضوع گفتگو بنایا: ''تعبُّد کے ساتھ تحمل۔''

علم اور خشیت وتواضع لازم وملزوم ہیں۔ اعلیٰ درجہ کی عبادت گزاری کے ساتھ دوسروں کے تئیں صبر وبرداشت اور عفو وچشم پوشی روح دین ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے:

كُونُوا رَبَّانيين علمآء حَلمآء فقهآء.

لوگو! خدا پرست بنو۔ صاحب علم اور صاحب حلم بنو اور تفقہ اور بصیرت پیدا کرو۔

اس گفتگو میں تین باتوں پر زور دیا:

۱۔ اپنی زندگی کا ہدف ابھی سے متعین کرو اور اس کے حصول میں لگ جاؤ۔

۲۔وقت کا بھرپور استعمال کرو۔

۳۔اہلِ علم کی توقیر کرو۔

صدارت حافظ عبدالغفار روپڑی کی تھی۔انھوں نے حضرت ابودرداءؓ کی حدیث سنائی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمایا:

لَا یکون عالماً إلّا اَن یکون متعلّماً.

عالم وہی بنتا ہے جو پہلے طالب علم بنے۔

طلبہ کے سوالات دلچسپ تھے مگر زیادہ تر موضوع سے غیر متعلق تھے۔

سوال نمبر ۱۔سیاست داں مجرم ہیں،اصلاح کیسے ہوگی؟

میں نے قرآن کریم کی آیت پڑھی اور خود اپنی اصلاح کرنے پر زور دیا:

یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُواْ عَلَیْكُمْ أَنفُسَكُمْ لاَ یَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَیْتُمْ. (المائدہ:۱۰۵)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو،اپنی فکر کرو۔کسی دوسرے کی گمراہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا اگر تم خود راہِ راست پر ہو۔

سوال نمبر ۲۔میڈیا کا استعمال کتنا مفید یا مضر ہے؟

میں نے بتایا کہ دین کی دعوت کے لیے میڈیا کا استعمال بہتر ہے مگر نیم عالم ٹیلی ویژن چینلوں پر اسلام کی رسوائی کا سبب بنتے ہیں۔محض نام ونمود اور مسلک کی تشہیر کے لیے میڈیا کا استعمال غلط ہے۔

سوال نمبر ۳۔علمائے دین اور سیاست دانوں میں خلیج بڑھتی جارہی ہے،اس کا تدارک کیسے ہو؟

میں نے عرض کیا۔دونوں اپنے اپنے میدانوں میں نصح وخیر خواہی کے تقاضوں کو پورا کریں۔ علمائے دین کی اصلاحِ معاشرہ مہم سرعت اور حکمت سے جاری رہے مگر اخلاص وللٰہیت کے ساتھ۔ سیاست داں اپنے فرائض ایمان داری سے ادا کریں تو دونوں طبقے ایک دوسرے سے قریب ہوتے جائیں گے مگر محمد اقبال کا نوحہ دونوں طبقوں پر ہے:

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

سوال نمبر۴۔ مدارس کے طلبہ بے توقیر کیوں ہیں؟

اس لیے کہ وہ عرفانِ نفس اور عزتِ نفس سے محروم ہیں۔ اپنے مقام و منصب کو فراموش کر کے کاسۂ گدائی لیے ہر در پر دستک دے رہے ہیں۔ علم دین کا اعتبار و استناد آج بھی قائم ہے مگر حاملینِ علم اور علمائے اسلام ادراک سے قاصر ہیں۔ محمد اقبال نے بلاوجہ شکوہ نہیں کیا تھا:

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

اور دین فروشی میں مست علمائے سُو پر دیکھئے، کتنی سخت تنقید ہے اُن کی:

یہی شیخ حرم ہے جو چُرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بو ذرؓ و دستِ اویسؒ و چادر زہراؓ

بے رحم نہیں، برہم

اساتذۂ کرام کے سوالات تعلیم و تدریس کے عملی مسائل سے متعلق تھے مگر اُن کی فکرمندی کے غماض تھے۔ ایک بزرگ استاد طلبہ و اساتذہ کے روبہ زوال تعلقات پر ماتم کناں تھے۔ میں نے عرض کیا: تعلیم و تربیت کا عمل بڑا تزکیہ چاہتا ہے۔ صبر و ضبط اور مزاجی استحکام کا طالب ہے۔ باپ کی سخت گیری مگر اپنے بچوں جیسی شفقت اور توجہ چاہتا ہے۔ استاد برہم ہوسکتا ہے، بے رحم نہیں ہوسکتا۔ طلبہ کو اگر اساتذہ کے تئیں یہ اطمینان ہوجائے تو آج بھی روٹھی بہاریں واپس آسکتی ہیں۔ تعلقات میں حلاوت اور رشتوں میں حرارت دوڑ سکتی ہے۔

دوسرے استاد نے اپنی بے چینی اس طرح ظاہر کی:

عالمیت کے آخری درجے میں اگر طالب علم کو ہوش آئے اور وہ اپنی اصلاح کرنا چاہے تو کیا کرے؟

میں نے ان کا اضطراب رفع کرنے کے لیے قدرے طویل جواب دیا:

اصلاح کی فکر جب بھی ہوجائے اُسے توفیق ربانی سمجھیں۔ اُسی لمحے سے طالب علم اپنا سفر

خلوص کے ساتھ شروع کردے۔ اور اساتذہ اس کے ساتھ تعاون کریں۔ اسے مایوس نہ ہونے دیں اُسے یہ کہہ کے اصلاحِ نفس کے سفر سے نہ روکیں:

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن
آخر عمر میں کیا خاک مسلماں ہوگے

انسان کو جس لمحے اپنی کوتاہی محسوس ہو وہ اسے دور کرنے میں لگ جائے اور ندامت کے اِس احساس سے رفعِ درجات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ احسان دانش نے ایسے ہی موقع پر کہا تھا:

بیٹھے بیٹھے آیا گناہوں کا خیال
آج شاید تری رحمت نے کیا یاد مجھے

اساتذہ کو یہ بات بھی مستحضر رہنا چاہیئے کہ ہر طالب علم شیخ الحدیث، شیخ التفسیر یا ماہر شریعت نہیں بن سکتا اور نہ یہ مطلوب ہے۔ ہاں ایک متمدن اور خادم انسانیت شہری وہ ضرور بن سکتا ہے اگر سلیقے سے اُس کی تعلیم وتربیت کی جائے۔ عالمیت سے فراغت کے بعد جس طالب علم کو دلچسپی ہوگی وہ خداداد ذہانت ولیاقت اور ریاضت سے علوم کی منزلیں طے کرلے گا۔ آپ مطمئن رہیں کہ اپنا فریضہ ادا کردیا ہے۔

ایک جوان العمر اور جوان الفکر استاد کا سوال دیکھیے:

کسی مضمون میں تخصص اور امتیاز کیسے پیدا کیا جائے؟

میرا جواب تھا: آپ مطالعہ میں انتخابی منہج کا استعمال کریں یعنی:

(الف) اپنے مضمون سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کریں۔ ہر موضوع کو خواہ اُس کی نوعیت کیسی ہو، پڑھنے کی ہوس دل سے نکال دیں۔ وقت محدود ہے۔ تمام موضوعات کا آپ احاطہ نہیں کرسکتے۔ جو لوگ ہر موضوع کو پڑھنے پر اصرار کرتے ہیں، اُن کا مطالعہ وسیع ہوسکتا ہے مگر وہ کسی مضمون کے متخصص نہیں بن سکتے۔

(ب) اپنے منتخب موضوع پر بھی امہات کتب پڑھیے۔ معتبر مصنفین کی تحریروں کا مطالعہ کیجیے۔ اہل رائے اور ارباب ادب کو پڑھیئے۔ تحقیق واجتہاد کرنے والے ارباب قلم کو پڑھیئے اور تنقیدی نگاہ سے پڑھیئے۔ کچھ سالوں میں آپ کے اندر تخصص کی شان نمودار ہونے لگے گی۔

مفسر قرآن حافظ عبدالوہاب روپڑی

محدث روپڑی اکیڈمی کی منتخب لائبریری کی زیارت بھی ہوئی۔ وہاں مفسر قرآن حافظ عبدالوہاب روپڑی سے ملاقات ہوئی۔ وہ قرآن مجید کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ تین جلدوں میں مکمل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پہلی جلد شائع ہو چکی ہے جو اپنے دستخط کے ساتھ فاضل مفسر نے راقم کو عطا کی:

''تفسیر موضح الفرقان (جلد اول) سورہ الفاتحہ تا سورہ آلِ عمران، محدث روپڑی اکیڈمی، جامع القدس چوک دال گراں، لاہور (مئی ۲۰۱۸ء)

برادر اکبر حافظ عبدالغفار روپڑی، امیر جماعت اہل حدیث پاکستان نے مختصر تعارف اس طرح کرایا ہے:

> ''قرآنی آیات کی تفسیر آیاتِ قرآنیہ، احادیثِ صحیح وحسن، حسب ضرورت اقوال صحابہ وتابعین کی روشنی میں تفسیر بالرائے کی جگہ تفسیر بالماثور کو ترجیح، تحقیق وتخریجِ احادیث کا اہتمام''

جن احادیث سے استدلال تفسیر موضح الفرقان میں کیا گیا ہے اُن کی صراحت بھی برادر اکبر نے کردی ہے: ''احادیث مرفرعہ وغیر مرجوحہ کی روشنی میں''

''تفسیر بالماثور اور منہج سلف کے عین مطابق۔''

حافظ عبدالوہاب روپڑی کا اسلوب تفسیر یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات کا پہلے ترجمہ پیش کرتے ہیں اس کے بعد ''مشکل الفاظ کے معانی'' کا عنوان قائم کر کے لغات قرآن کی تشریح کرتے ہیں پھر ''التوضیح'' کے عنوان کے تحت تفسیر بیان کرتے ہیں۔ سورہ الفاتحہ کی تفسیر میں فاضل مفسر رب العالمین کی تشریح اس طرح کرتے ہیں:

> ''عربی زبان میں رب ایک ایسے بااختیار مالک کو کہتے ہیں جو اپنی زیرِ ملک چیز کو خود پروان چڑھائے اور اس کی اصلاح وتربیت کا پورا پورا بندوبست کرے۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ ہی پوری کائنات کا مالک اور خالق ہے اور تنِ تنہا ساری کائنات کا نظام چلاتا ہے اس لیے وہ تمام جہانوں کا پالن ہار ہے۔

لفظ 'رب' اللہ تعالیٰ کے سوا بغیر اضافت کے کسی مخلوق کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں۔

العالمین عالم کی جمع ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کے سوا سب مخلوقات کو عالَم کہتے ہیں۔ اِن جمیع مخلوقات کا مربی اور معبودِ برحق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔'' (تفسیر موضح الفرقان، جلد اول، ص:۶۶)

سلفی منہاجیاتِ تفسیر

الرّحمٰن الرّحیم کی وضاحت میں سلفی منہج کی نمائندگی دیکھیے، حافظ عبدالوہاب روپڑی کس طرح کرتے ہیں۔ وہ اسلاف کے اقوال سے استدلال کرتے ہیں۔ حدیث کا مکمل حوالہ نقل کرتے ہیں مگر عربی شاعر کی تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھتے:

''حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں: رحمٰن اُسے کہتے ہیں جو اُس سے مانگا جائے وہ عطا کرے اور رحیم اُس ذات کو کہتے ہیں جب اُس سے سوال نہ کیا جائے وہ ناراض ہو۔ جیسا کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **مَن لَم یسئَل اللّٰہ یَغضبُ علیہ.**

جو شخص اللہ سے سوال نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہو جاتا ہے۔ (**سنن الترمذی، کتاب الدعوات، باب من لم یسئل اللّٰہ یغضب علیہ**، جزو۹، ص:۴۷، رقم حدیث:۳۳۷۳)

عربی کا ایک شاعر کہتا ہے:

اللّٰہُ یغضبُ إن ترکتَ سؤالَہُ
و بنو آدمَ حین یُسئَلُ یَغضب

(اگر اللہ تعالیٰ سے سوال نہ کیا جائے وہ ناراض ہو جاتا ہے۔ اور انسان سے مانگا جائے تو وہ غضب ناک ہو جاتا ہے۔)

محدث روپڑی اکیڈمی میں بعض دیگر علمائے اہلِ حدیث کی تفسیروں کی بھی زیارت ہوئی:

۱۔ تفسیر القرآن الکریم [چار جلدیں] از حافظ عبدالسلام بن محمد، دارالاندلس (لاہور)

۲۔ تفسیر دعوۃ القرآن (ترجمہ قرآن از حافظ عبدالسلام بن محمد) تفسیر از ابونعمان سیف اللہ خالد، دارالاندلس (لاہور)

۳۔ تیسیر القرآن از عبدالرحمٰن کیلانی [چار جلدیں] مکتبہ السلام (لاہور، ۱۴۳۱ھ، نظر ثانی: عبدالوکیل علوی۔

چائے کی محفل میں مفسر قرآن حافظ عبدالوہاب روپڑی نے جو سوالات کیے اُس سے میری بے چینی بڑھ گئی۔ وہ شطحات کی محفل تھی اور بے تکلفی کے ماحول میں کسی رسمی آداب سے بے نیاز، مگر علمائے دین کی سوچ اور منہج فکر کی ترجمان ضرور تھی۔

اُن کے بعض سوالات غیر سنجیدہ تھے اس لیے راقم نے اُن پر توجہ نہ دی۔ خاموشی کو بہتر جانا۔ عام ہندوؤں کے تعصب کی تراشیدہ کہانیاں، نقلی ویڈیو کے ذریعہ ظلم و وحشت کی تصویریں عام پاکستانی نوجوانوں کو ہی نہیں تعلیم یافتہ اور علمائے دین تک کو مسموم کر رہی ہیں۔ ہاں حافظ عبدالغفار روپڑی کے سوالات اہم تھے۔ ہندو مذہب کے اندر اصلاح کی تاریخ، بھکتی تحریک، کبیر داس، گرونانک اور رامانج کے ذریعہ چلائی گئی اصلاحی تحریکیں اور ہندو معاشرہ پر مسلمانوں کے عقیدہ توحید کے اثرات اُن کی گفتگو کے موضوعات تھے۔ مجھے اُن کی معلومات قابلِ رشک محسوس ہوئیں اور جذبۂ دینی وملّی سے پُر بھی۔

شاہد الہاشمی کے ساتھ جمع بین الطّعامین

شاہد الہاشمی، چیرمین ادارہ معارف اسلامی (کراچی) کی رفاقت میں جناب حافظ اسرار احمد نے اپنے دولت کدے پر ۲۶ رنومبر ۲۰۲۲ء کو ناشتہ کا اہتمام کر رکھا تھا جس میں حافظ عبدالوحید روپڑی کے ساتھ اسلامک پبلی کیشنز (لاہور) کے ڈائرکٹر طارق محمود بھی مدعو تھے۔ میزبان نے اتنا پُر تکلف انتظام کیا تھا کہ ناشتہ کے ساتھ ظہرانہ بھی کفایت کر گیا۔ میں نے اُسے جمع بین الطعامین کا نام دیا مگر زندہ دلانِ لاہور اسے Brunch کہتے ہیں یعنی Breakfast اور Lunch کا مرکب۔

وہاں سے فراغت ہوئی تو اسلامک پبلی کیشنز، وحدت روڈ لاہور کے دفتر میں طارق محمود کے ساتھ بارہ بجے حاضر تھے۔ میری بعض کتابیں اس ادارے نے شائع کی ہیں۔ حافظ عبدالوحید خاں اُس وقت ڈائرکٹر تھے:

۱۔ Principles of Diplomacy in Islam, 1996

۲۔ جدید ترکی میں اسلامی بیداری (شیخ بدیع الزماں سعید نورسیؒ سے پروفیسر نجم الدین اربکانؒ تک (۱۹۹۹ء)

دفتر میں جناب اختر حسین عزمی تشریف لائے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تشکیل جدید فکر اسلامی میں حصہ داری پر آپ کا مقالۂ ڈاکٹریٹ شائع ہو چکا ہے۔ بڑا جامع اور متوازن مطالعہ ہے۔ آج انھوں نے اپنی ایک دوسری کتاب تحفے میں دی جو اسلامک پبلی کیشنز ہی کی پیش کش ہے: ''آدابِ اختلاف'' (اتحادِ امت کا قابلِ عمل راستہ) ستمبر ۲۰۲۱ء، صفحات ۲۲۷۔

جماعت اسلامی میں روحانیت

ڈاکٹر اختر حسین عزمی جماعتِ اسلامی سے وابستہ ہیں مگر جماعت کے اندر روحانیت کی بڑھتی کمی انھیں تشویش میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ آزادی سے قبل جب جماعت اسلامی کی تشکیل ہوئی تھی علمائے دین اور متقی دانش وروں کی بڑی تعداد نے مولانا مودودیؒ کی دعوت پر لبیک کہا تھا۔ احیائے اسلام کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے کارکنان گھبراتے نہ تھے۔ نمازوں سے شغف، تقویٰ وطہارت کی پاسداری اور اوراد و وظائف کا اہتمام، حلال وحرام میں تفریق، مشکوک اور مشتبہ چیزوں سے اجتناب کارکنان اور رہنماؤں کا امتیازی وصف تھا۔ اب صورتِ حال برعکس ہے۔

ہندوستان کی جماعت اسلامی پر میں کوئی تبصرہ نہیں کرسکتا کہ میرا مطالعہ ومشاہدہ محدود ہے۔ پاکستان کی جماعت اسلامی پر انتخابی سیاست کے گہرے اثرات ہیں۔ اس کے تدارک کی صورت کیا ہو؟ ڈاکٹر عزمی بڑے کبیدہ خاطر تھے۔

میں نے عرض کیا۔ تحریکیں جب عوام میں اثر ونفوذ کرتی ہیں، اُن کی تنظیم وتوسیع ہو جاتی ہے، ملک کے مسائل اور بحرانوں کے گرداب میں پھنستی ہیں تو آخری درجے کے کارکنان کی تربیت بُری

طرح مجروح ہوتی ہے۔اُن کی نظریاتی وابستگی بھی کمزور پڑ جاتی ہے اور ایثار و ترجیح کا بلند معیار بھی زوال کا شکار ہونے لگتا ہے۔ اِن عوامی کارکنوں کا احتساب کرنے کی جگہ جب اُن کی ناز برداری قیادت کی طرف سے ہونے لگے تو سمجھیئے کہ روحانیت کو زوال آ گیا ہے۔احتساب و محاسبہ اور تقویٰ کا ترجیحی پروگرام ہی تحریک کو اُس کے شاندار ماضی کی طرف لوٹا سکتا ہے۔

جماعت اسلامی ہند میں ابھی زوال کی یہ صورت نہیں ہے۔علمائے دین کی مرکزی قیادت میں موثر موجودگی کی وجہ سے روحانیت کا سفر جاری ہے مگر ہر لمحہ احتساب کی ضرورت ہر جگہ ہے۔

ڈاکٹر عزمی کا تجزیہ تھا کہ جماعت اسلامی میں مولانا مودودیؒ کے بعد قحط الرجال ہے۔ارباب علم و فکر کا فقدان ہے۔اجتہاد اور جدّت فکر و نظر عنقا ہے۔میں نے جواب دیا کہ مولانا مودودیؒ کو اللہ نے مجدد اور متکلم اسلام بنایا تھا، اُن کا مقابلہ دوسرے مفکرین سے کرنا نافہمی ہے مگر مولانا صدرالدین اصلاحی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا محمد فاروق خاں، مولانا سید حامد علی، مولانا سید جلال الدین عمری، مولانا سید احمد قادری، مولانا جلیل احسن ندوی، سید سعادت اللہ حسینی، محی الدین غازی، ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، میاں طفیل محمد، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا خلیل احمد حامدی، ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی، ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی، مولانا محمد یوسف اصلاحی، پروفیسر خورشید احمد، مولانا نعیم صدیقی، ملک غلام علی غرضیکہ ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔ان سب کا کردار اسلامی و دینی ادب کی تیاری میں بہت اہم ہے۔ہاں نئے موضوعات کا انتخاب اور نوجوانوں کو نیا بیانیہ فراہم کرنا وقت کی شدید ضرورت ہے۔

آج ہی ۴ر بجے سہ پہر میں ڈاکٹر شبیر احمد منصوری کی عیادت کے لیے اُن کے گھر حاضر ہوئے۔اُن کی اہلیہ ڈاکٹر آسیہ شبیر سے بھی ملاقات ہوئی وہ ویمنس کالج یونیورسٹی لاہور میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں شعبہ علوم اسلامیہ میں۔نماز مغرب کی ادائیگی ڈاکٹر سیف اللہ فیضی کی پُرسوز امامت میں اُنہی کے دولت کدے پر ہوئی۔واپسی میں چار ڈبّوں میں شہد کی سوغات ڈاکٹر منصوری کی اہلیہ نے گاڑی میں رکھ دی۔

ڈاکٹر منیر احمد رسول پوری دو بیویوں کے خادم ہیں، مالک نہیں۔انھیں راقم نے دو ڈبّے ہدیہ کر دیے۔ایک ڈبّہ ڈاکٹر سیف اللہ فیضی کو اور چوتھا ڈبّہ ان دونوں کے مشترکہ دوست ابوبکر کو تحفہ میں عطا کر دیا اور خود محبتوں کی جھولی لٹکائے واپس آیا۔ابوبکر نے علوم اسلامیہ میں ایم اے اور ایم فل کر لیا

ہے۔ بی ایڈ کا کورس بھی مکمل کیا ہے۔ اسی لیے فن تعلیم کے قرآنی تناظرات کے کسی پہلو پر ڈاکٹریٹ کے خواہش مند ہیں۔

رات میں ساڑھے نو بجے تینوں احباب پھر مجلس گرم کرنے کے لیے آ حاضر ہوئے۔ گیارہ بجے تک فکری و ادبی شطحات کی گولہ باری ہوتی رہی۔ حافظ عبدالوحید روپڑی آج رات حافظ عبدالغفار روپڑی کی قیادت میں دہاڑی تشریف لے گئے۔ اصلاح معاشرہ کے ایک جلسے میں وہاں شرکت کریں گے اور اپنے کسی حبیب کے ہاں تعزیت بھی پیش کریں گے۔ حفیظ میرٹھی نے کتنی خوبصورت ترجمانی کی ہے:

بھر نہ آئے جو کسی کی بے کسی پر اے حفیظ
اُس کو کیسے آنکھ کہہ دیں، اُس کو کیسے دل کہیں

مغیث احمد *

ترجمۂ مثنوی معنوی
قاضی سجاد حسین — تنقیدی مطالعہ

برصغیر ہندو پاک میں فارسی زبان و ادب کی خدمات بالخصوص فارسی کتابوں کے اردو تراجم کے حوالے سے جب بھی بات ہوگی تو قاضی سجاد حسین کا نام لیے بغیر بات ادھوری رہ جائے گی۔ قاضی سجاد حسین ایک باشرع عالم دین، مقبول معلم، مشہور محدث، معروف محقق، منفرد مؤرخ، تذکرہ نگار اور بے مثال مترجم کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ فارسی کتابوں کے اردو تراجم کے تعلق سے قاضی سجاد حسین کا نام زریں حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ قاضی سجاد حسین نے جہاں فارسی کتب بینی کے راستے ہموار کیے، وہیں آزادی کے بعد سے روبہ زوال ہو رہی فارسی زبان و ادب سے متعلق بہت سی کتابوں کے حواشی، حل لغات اور تراجم کر کے اسے حیات ثانی بخشی اور اس کی ترویج و ترقی کے جو بھی بنیادی اقدامات اٹھائے جاسکتے تھے، اسے روبہ عمل لانے کی حتی الوسع کوشش کی۔

قاضی سجاد حسین ۱۹۱۰ء مطابق ۱۳۲۸ ہجری مغربی اتر پردیش کے ضلع بجنور میں واقع 'کرتپور' میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن میں حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند چلے گئے جہاں سے ۱۹۲۸ء میں محض اٹھارہ سال کی عمر میں انھوں نے سند فضیلت حاصل کی، پھر پنجاب

*اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی، یوپی ای میل: moghees.ahmad5@gmail.com

یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان امتیازی نمبرات سے پاس کیا۔تحصیل علم کے بعد مدرسہ عالیہ عربیہ فتحپوری دہلی سے وابستہ ہوگئے۔ قاضی سجاد حسین کا انتقال ۲۴؍دسمبر ۱۹۹۰ء مطابق ۵؍جمادی الثانی ۱۴۱۱ہجری کو دہلی میں ہوااور'حوض رانی' دہلی کے قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔

قاضی سجاد حسین نے کم وبیش پینتالیس (۴۵) برسوں تک تدریسی وتحقیقی خدمات انجام دیں اور تقریباً تیس برسوں تک صدر مدرس اور شیخ الحدیث کے عہدوں پر فائز رہے۔اس طویل عرصہ میں انھوں نے سیکڑوں طلبا کو دینی علوم سے فیضیاب کیا۔۱۹۶۷ء میں حکومت ہند نے قاضی سجاد حسین کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں'صدر جمہوریہ ہند ایوارڈ' سے سرفراز کیا۔

قاضی سجاد حسین کو عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ان کا شمار اپنے وقت کے جید عالم دین، جلیل القدر فقیہ اور ایک منجھے ہوئے مترجم کے طور پر ہوتا ہے۔ان کی پہلی کتاب "**التوشیحات علی السبع المعلقات**" ہے۔سبع معلقات: یعنی سات ایسے قصیدے جو زمانۂ جاہلیت میں آب زر سے لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکائے گئے تھے، عربی زبان وادب میں''**سبع معلقات**'' کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کی ادبی حیثیت بطور مثال بیان کی جاتی ہے۔قاضی سجاد حسین نے''**سبع معلقات**'' پر حاشیہ آرائی کی اور اس کا اردو میں ترجمہ کر کے طلبا واساتذہ کے لیے کافی آسانیاں فراہم کیں۔

قاضی سجاد حسین نے عربی کے علاوہ فارسی کی کئی اہم کتابوں کا سلیس اردو زبان میں ترجمہ کیا۔عہد حاضر میں متعدد مدارس، کالجوں حتی کہ یونیورسٹیوں میں داخل نصاب رہیں فارسی کی متعدد کتابوں پر انھوں نے نہ صرف حاشیہ لگایا بلکہ اس کا اردو میں ترجمہ بھی کیا اور اس کے شروحات لکھ کر ان کی شہرت ومقبولیت میں چار چاند لگائے۔گلستان، بوستان، گلزار دبستان، حمد باری، کریما سعدی، پندنامہ عطار، مالابدمنہ، دیوان حافظ اور مثنوی معنوی مولانا روم از دفتر اول تا دفتر ششم وغیرہ جیسی کتابوں پر مفید حاشیہ آرائی کی، ان کے مشکل الفاظ کے حل لغات رقم کیے اور ان کے ترجمے بھی لکھے۔فارسی کی مذکورہ بالا کتابوں کو شہرت دلانے اور انھیں قبولیت عام بخشنے میں قاضی سجاد حسین کا کردار قابل تحسین ہے۔قاضی سجاد حسین کی زیادہ تر کتابیں سب رنگ کتاب گھر دہلی سے شائع ہوئیں، جو بعد میں ملک وبیرون ملک کے مختلف مطبوعات سے شائع ہوتی رہی ہیں۔قاضی سجاد حسین کا سب سے اہم کارنامہ''مثنوی معنوی

مولانا روم'' کے چھ دفاتر کا اردو نثری ترجمہ ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں سب سے پہلے قاضی سجاد حسین کے تراجم کا مختصر اتعارف کرایا جائے گا اور پھر ان کے ''ترجمۂ مثنوی معنوی'' کا بالاستیعاب جائزہ لیا جائے گا۔

گلستان سعدی

''گلستان'' شیخ سعدی شیرازی کی شہرۂ آفاق کتاب ہے۔ یہ نظم آمیز نثر میں لکھی گئی ہے، ''گلستان'' کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کا انوکھا اسلوب، بے مثال طرز بیان اور امثال وحکم، احادیث واشعار سے سجی اس کی مسجع عبارتیں ہیں۔ ''گلستان'' کی عبارتوں میں جگہ جگہ پر امثال وحکم کے موتی، عربی وفارسی اشعار کے ہیرے جواہرات، قرآنی آیتوں کے قمقمے اور احادیث مبارکہ کے زیورات موجود ہیں۔ شیخ سعدی نے ''گلستان'' کو اخلاقی پیغامات اور دلچسپ حکایات سے آراستہ کر کے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ ''گلستان'' کی عبارت اتنی سادہ، دلکش، دلفریب، جاذب اور مختصر ہے کہ بسا اوقات دو سے تین سطر میں ہی پوری کہانی مکمل ہو جاتی ہے اور پڑھنے والا اس دو تین سطری حکایت سے بہت کچھ سبق آموزی کر لیتا ہے۔ شیخ سعدی ایک موقع پر ''گلستان'' کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بچہ کار آیدت ز گل طبقی
از گلستان من ببر ورقی
گل ہمین پنج روز و شش باشد
وین گلستان ہمیشہ خوش باشد

(ترجمہ) پھولوں سے بھرا ہوا طباق تیرے کس کام آئے گا، میرے گلستان سے ایک ورق لے جاؤ؛ پھول تو بس پانچ یا چھ دن ہی باقی رہ سکیں گے، جب کہ ہمارا گلستان ہمیشہ تر وتازہ رہے گا۔

''گلستان'' ۶۵۶ ہجری میں تصنیف ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی مقبولیت کے چرچے چہار دانگ عالم میں پھیل گئے۔ ''گلستان'' کئی صدیوں سے برصغیر ہندو پاک بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک میں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر داخل نصاب رہی ہے اور آج بھی پڑھی اور پڑھائی جا رہی ہے۔

''گلستان'' کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ابھی تک اس کی پیروی میں سیکڑوں ادیبوں نے کتابیں لکھیں، لیکن ''گلستان'' کی اہمیت ومقبولیت بدستور باقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے تصنیف سے ابھی تک ''گلستان'' کے متعدد نسخے تیار کیے گئے اور دنیا کے تقریباً سبھی مشہور زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ سندھی زبان میں ''ترجمہ گلستان'' مولانا محمد قاسم سومرو، روشنی پبلی کیشن کندیارو سندھ-۱۹۹۷ء کافی مشہور ہے، ان کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی اس کے کئی ترجمے ہوئے ہیں، جب کہ اردو میں گلستان کے ترجموں میں ''بہارستان'' مولانا ظہیر احمد، مکتبہ رحمانیہ لاہور؛ ''بہار گلستان'' مفتی ظفر عالم دیناجپوری، دارالکتاب دیوبند کے علاوہ قاضی سجاد حسین کا ''ترجمۂ گلستان'' کافی مشہور ومقبول ہے۔

بوستان سعدی

''بوستان'' بھی شیخ سعدی کی مشہور زمانہ کتاب ہے، جس میں اخلاقی حکایتوں کو نظمیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۶۵۵ ہجری میں تصنیف ہوئی، جس کی شہرت ومقبولیت آج قائم ہے۔ ''بوستان'' برسوں سے اسلامی مدارس، اہل تصوف کے حلقوں، علماء کی مجلسوں اور خانقاہوں کی زینت رہی ہے۔ ''بوستان'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:

> ''ان دونوں کتابوں (گلستان و بوستان) میں یہ بات بھی تعجب انگیز ہے کہ باوجودے کہ صنائع لفظی ومعنوی ان میں کثرت سے موجود ہیں اور تقریباً نصف گلستان کے فقرے مسجع اور مقفع ہیں، بااین ہمہ وہ سادگی میں ضرب المثل ہیں اور جہاں نثر عاری کا ذکر آتا ہے، وہاں سب سے پہلے گلستان کی مثال دی جاتی ہے، فی الواقع یہ شیخ کے کمال انشاپردازی کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔'
> .....''بوستان'' میں کل دس ابواب ہیں جن کی تفصیل اس طرح ہے: ۱۔عدل و رائے وتدبیر، ۲۔فضیلت احسان، ۳۔عشق ومستی وشور، ۴۔تواضع، ۵۔رضا، ۶۔قناعت، ۷۔تربیت، ۸۔شکر بر عافیت، ۹۔توبہ وثواب، ۱۰۔مناجات[۱]

''بوستان'' آج بھی برصغیر پاک و ہند کے کئی مدارس میں داخل نصاب ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں۔ اردو میں ''بوستان'' کے کئی ترجمے ہوئے ہیں۔ جن میں ''ترجمہ

بوستان'' پروفیسر محمد عنایت اللہ، ملک دین محمد ایڈسنز لاہور-۱۹۳۴ء؛ ''ترجمہ بوستان'' مولانا غلام حسن قادری، مشتاق بک کارنر لاہور؛ ''بہار بوستان'' فضل الرحمٰن دھرم کوٹی، دارالکتاب دیوبند کے علاوہ قاضی سجاد حسین کا ترجمہ کافی مشہور ہے، قاضی سجاد حسین نے اپنے ترجمہ میں مشکل الفاظ کے حل لغات اور متن میں شامل اصطلاحات ومحاورات کی وضاحت کے لیے مفید حاشیہ آرائی بھی کی ہے۔

کریما سعدی

معلم اخلاق شیخ شرف الدین سعدی شیرازی کی مشہور کتابوں میں 'گلستان و بوستان' کے علاوہ ان کی ''کریما'' بھی ہے، جسے ''پندنامہ'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ سعدی کی تصانیف کے بارے میں حالی لکھتے ہیں:

> ''شیخ کا تمام کلام نظم، نثر، فارسی اور عربی جو اس وقت متداول ہے اور جس کو شیخ علی بن احمد ابن ابی بکر نے، شیخ کی وفات سے بیالیس برس بعد علی الترتیب جمع کیا ہے، حسبِ تفصیل ذیل ہے: ۱۔ نثر میں چند مختصر رسالے (جن میں سلوک اور تصوف کے مضامین اور مشائخ وعرفا کی حکایتیں اور ملوک وحکام کے لیے نصیحتیں لکھی ہیں) ۲۔ گلستان، ۳۔ بوستان، ۴۔ پندنامہ (جس کو عرف عام میں 'کریما' کہتے ہیں)۔''[۲]

دو معروف مغربی محققین ایل کرانمر بینگ اور ڈاکٹر ایس اے کپاڈیہ نے ''اسکرول آف وزڈم'' کے نام سے مشترکہ طور پر ''کریما'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا، جو آرتھر این واسٹن کے مبسوط مقدمہ کے ساتھ ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا تھا۔ واسٹن نے اپنے مقدمہ میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ شیخ سعدی کی ''کریما'' اور ''پندنامہ'' دونوں ایک ہی کتاب کا نام ہے۔ واسٹن رقمطراز ہیں:

> The Pand Namah, or Scroll of Wisdom (It may, however, be explained that the earlier MSS do not contain this work, which was first ascribed to Sadi about A.D. 1438.) a small volume of poetry.[۳]

اس سے معلوم ہوا کہ سعدی کی تصنیف ''کریما'' کو 'پندنامہ' بھی کہا جاتا ہے، جس کا ذکر مختلف تذکرہ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ بہرحال یہ ایک تحقیق کا مسئلہ ہے، جس پر کسی اور موقع پر تفصیل سے بات ہوگی۔ سردست عرض یہ کرنا ہے کہ ''کریما'' شیخ سعدی کے اخلاقی نظموں کا مجموعہ ہے، جس کے اندر انھوں نے مختلف عنوانات کے تحت اخلاقیات کا درس دیا ہے۔ کتاب کا آغاز 'مناجات بہ درگاہ مجیب الدعوات' اور 'در ثنائے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد سعدی مختلف عنوانات مثلاً: 'خطاب بہ نفس، در مدح کرم، در صفت سخاوت، در مذمت بخیل، در صفت تواضع، در مذمت تکبر، در فضیلت علم، در امتناع از صحبت جاہلان، در صفت عدل، در مذمت ظلم، در صفت طاعت و عبادت، در مذمت شیطان، در بیان شراب محبت و عشق، در صفت وفا، در فضیلت شکر، در بیان صبر، در صفت راستی، در مذمت کذب، در صنعت حق تعالیٰ' اور 'در منع امید از مخلوقات' کے ذریعہ اپنے قارئین کو بڑے ہی مؤثر انداز میں اخلاقیات کا درس دیتے ہیں۔ ''کریما'' کے عنوانات کو دیکھ کر اس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ''کریما'' کے متعدد ترجمے ہوئے ہیں۔ بنگلہ زبان میں ایک ترجمہ کو نورلائبریری ڈھاکہ سے شائع ہوا تھا، جب کہ اردو میں ''کریما'' کے کئی ترجمے ہوئے ہیں، جن میں ''ترجمہ اردو کریما'' جے ایس سنت سنگھ اینڈ سنز لاہور-۱۹۳۲ء؛ ''گوہر بے بہا اردو شرح کریما'' مولوی محمد انعام اللہ، قدیمی کتب خانہ کراچی؛ ''ترجمہ کریما'' محمد عبدالحکیم شرف قادری، مکتبہ قادریہ لاہور کے علاوہ قاضی سجاد حسین کا ترجمہ 'کریما' کافی مشہور ہیں۔ قاضی سجاد حسین نے ''کریما'' کے مشکل الفاظ و محاورات پر حاشیہ لگا کر اس کے مفاہیم کو مزید آسان بنانے کی کوشش کی ہے۔

ترجمہ دیوان حافظ

ایران کے چار ایسے بڑے شعرا گزرے ہیں جن کی شہرت کے ڈنکے پورے عالم میں بجتے رہے ہیں، جن میں سے ایک خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی بھی ہیں، جنھیں 'لسان الغیب' کے لقب سے ملقب کیا گیا تھا۔ حافظ شیرازی ایران کے مشہور شہر شیراز میں پیدا ہوئے۔ حافظ کا دیوان اپنی غنائی خوبیوں اور غیبی اشاروں کی وجہ سے انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ حافظ جتنے ایران میں مقبول ہیں اتنے ہی ہندوستان میں بھی ہر دلعزیز ہیں۔ حافظ کی شاعری اور ان کے دیوان کے دیوانے نہ صرف ایران بلکہ

ہندوستان میں بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ کشمیر سے بنگال تک سب کے سب ان کے بادۂ غزل سے بیخود ہوتے رہے ہیں۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

حافظ کی اسی شاعرانہ عظمت اور شہرت کی وجہ سے ہندوستان کے حکمرانوں نے انھیں یہاں آنے کی دعوت دی، لیکن 'گلگشت مصلیٰ' کی دلفریبیوں اور 'رکن آباد' کی فرحت بخش فضاؤں نے انھیں اپنے دامن میں اس طرح اسیر کرلیا تھا کہ وہ دنیا کی ہر خوشی کو اس پر قربان کرنے کو تیار تھے۔

بدہ ساقی مئے باقی کہ درجنت نخواہی یافت
کنار آب رکن آباد و گلگشت مصلیٰ را

ترجمہ: اے ساقی! باقی شراب بھی مجھے دیدے، کیونکہ تجھے جنت میں 'رکن آباد' کی نہر کا کنارا اور 'مصلیٰ' کی سیر گاہ نصیب نہیں ہونے والی ہے۔

اسی طرح حافظ کا یہ شعر:

نمی دہند اجازت مرا بہ سیر و سفر
نسیم خاک مصلیٰ و آب رکن آباد

ترجمہ: 'مصلیٰ' کی نسیمِ خاک اور 'رکن آباد' کا پانی مجھے کسی بھی سفر کی اجازت نہیں دیتی۔

حافظ کے دیوان کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایران کے لوگ اس کے اشعار کو اشارۂ غیبی تصور کرتے ہیں اور اس سے فال نکال کر اپنے مستقبل کے عزائم طے کرتے ہیں۔ حافظ کا دیوان صدیوں سے ہندوستان کے مدارس و مکاتب اور یونیورسیٹیوں میں شامل نصاب رہا ہے اور دنیا کی بہت سی زبانوں مثلاً اردو، انگریزی، ترکی، فرانسیسی و جرمن وغیرہ میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ اردو میں قاضی سجاد حسین کا ترجمہ اپنے اختصار اور طریقۂ اظہار کی وجہ سے کافی مقبول رہا ہے۔

جیسا کہ ماقبل میں ذکر ہوا۔ قاضی سجاد حسین نے ان کتابوں کے علاوہ بھی بہت سی کتابوں پر حاشیہ آرائی کی اور ترجمے لکھے ہیں۔ کئی کتابوں کی تدوین و ترتیب بھی کی ہے۔ قاضی سجاد حسین کے علمی

کارناموں کا احاطہ کرنا اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔ان کی تصنیفات وتالیفات اور تراجم باضابطہ تحقیقی مقالات کے متقاضی ہیں۔قاضی سجاد حسین کے انتقال کے بعد فروری ۱۹۹۱ء میں پروفیسر مختار الدین احمد نے 'وفیات' کے ذیل میں ایک مختصر مضمون شائع کرایا تھا، جس میں وہ قاضی سجاد حسین کی تصنیفات و تالیفات کا تعارف کراتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''ان (قاضی سجاد حسین) کی پہلی تصنیف جو راقم الحروم کی نظر سے گزری وہ ''التوشیحات علی السبع المعلقات'' تھی۔ سبعہ معلقہ کی اردو میں ان کی یہ شرح عرصہ ہوا شایع ہوئی تھی، اب یہ عام طور پر نہیں ملتی۔قاضی صاحب کی دوسری تصانیف حسب ذیل ہیں: ۱۔ترجمۂ گلستان سعدی، سب رنگ کتاب گھر دہلی، ۱۹۵۲ء، ۲۔ترجمۂ بوستان سعدی، سب رنگ کتاب گھر دہلی، ۱۹۶۱ء، ۳۔حاشیہ مالابدمنہ مصنفہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی (متوفی ۱۲۲۵ھ) اس کے آخر میں ''کلمات الکفر منقول از فتاوائے برہانی''، ''وصیت نامۂ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ''، ''احکام اضحیہ و وجوب آن'' اور ''رسالہ احکام عقیقہ از مولانا عبدالغفار لکھنوی بھی بطور ضمائم شامل ہیں۔سب رنگ کتاب گھر دہلی، ۱۹۵۶ء، ۴۔ترجمۂ دیوان حافظ، سب رنگ کتاب گھر دہلی، ۱۹۶۳ء، ۵۔ ترجمۂ مثنوی مولانا روم (دفتر اول تا ششم) سب رنگ کتاب گھر دہلی، ۱۹۷۴ء تا ۱۹۷۸ء۔ان کے علاوہ قاضی صاحب نے دو فارسی و عربی متون مرتب کر کے شائع کیے ہیں: ۶۔سراج الہدایہ (ملفوظات مخدوم جہانیان جہان گشت (۷۰۷-۷۸۵) یہ پروفیسر سید نورالحسن کی توجہ سے انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ نئی دہلی سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی۔کتاب کا تعارف پروفیسر سید نورالحسن کے قلم سے ہے۔۷۔قاضی صاحب مرحوم ومغفور کی زندگی کے آخری پانچ سات سال، آٹھویں صدی ہجری کے ممتاز حنفی عالم وفقیہ شیخ عالم بن العلاء الانصاری الاندرینی الدہلوی (متوفی ۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء) کی ضخیم کتاب

''الفتاوی التاتارخانیہ'' کی تصحیح و اشاعت میں گزرے۔عہد فیروزشاہ (۷۵۲ھ-۷۹۰ھ) کے اس مصنف نے تقریباً تیس فقہی مصادر سے جن میں سے متعدد ابواب مفقود ہیں یہ ضخیم کتاب مرتب کی تھی۔اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ جب اس کتاب کی ترتیب کی خبر فیروزشاہ تغلق (متوفی ۷۹۶ھ) کو ملی تو اس نے مصنف سے خواہش ظاہر کی کہ وہ یہ کتاب اس کے نام پر ''فتاوائے فیروزشاہی'' رکھیں۔مصنف نے خدا ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے بادشاہ وقت کی خواہش کا احترام نہ کرتے ہوئے اس کے ایک سردار تاتارخاں کے نام پر اپنی کتاب کا نام رکھا۔ ہرچند ''نزہۃ الخواطر'' میں اس کا نام ''زادالسفر'' یا ''زادالمسافرین'' لکھا۔ممکن ہے پہلے مصنف کے ذہن میں یہی نام ہو، لیکن یہ کتاب ''الفتاویٰ التاتارخانیہ'' ہی کے نام سے مشہور ہوئی۔''[۳]-(الف)

قاضی سجادحسین کے تراجم وتالیفات کے تعلق سے ان ضروری تمہیدات کے بعد اب ہم اپنے مضمون کے اصل موضوع یعنی 'ترجمۂ مثنوی معنوی قاضی سجادحسین کا تنقیدی جائزہ' کی طرف رجوع کررہے ہیں۔

فارسی زبان وادب سے تعلق رکھنے والے حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ ''مثنوی معنوی'' مولانا جلال الدین رومی کی وہ مشہور زمانہ عرفانی مثنوی ہے، جس کے بارے میں مولانا جامی نے بجاطور پر 'هست قرآن در زبان پهلوی ' کہا ہے اور جس کی تشریح وتوضیح میں علما، صوفیا اور اہل عرفان برسوں سے مصروف عمل ہیں، مگر ابھی تک کسی نے بھی اس کے معانی کی تہہ تک مکمل رسائی کا دعویٰ نہیں کیا، مولانا نے سچ ہی کہا تھا:

ہرکسی از ظن خود شد یار من
واز درون من نجست اسرار من

مولانا کی پوری شاعری معنویت سے لبریز ہے، ان کے کسی بھی شعر کو پڑھ لیں، اس سے آپ کے محسوسات کا کوئی نہ کوئی تار ضرور حرکت میں آجائے گا۔ایک ایسی حرکت جو دل ودماغ میں سرسراہٹ

پیدا کردے، ایک ایسی روشنی جو آپ کے لطیف احساسات کے بحر بیکراں میں چراغ راہ ثابت ہو۔

ترجمہ مثنوی معنوی

یوں تو ''مثنوی معنوی'' کو کئی زبانوں میں منتقل کیا گیا، اردو زبان میں بھی اس کے کئی تراجم منظر عام پر آئے، مگر زیر نظر مضمون میں قاضی سجاد حسین کے اردو نثری ترجمے پر بات کرنی ہے۔ قاضی سجاد حسین نے ''ترجمۂ مثنوی معنوی'' کے نام سے ''مثنوی معنوی'' کے کل چھ دفاتر کا اردو میں نہ صرف ترجمہ کیا ہے بلکہ اس کے مشکل الفاظ کے حل لغات اور حاشیے میں ضروری الفاظ و اصطلاحات کی تشریح و توضیح بھی کی ہے۔ علاوہ ازیں ''مثنوی معنوی'' کے ہر ایک دفتر کے آغاز میں انتہائی جامع اور مبسوط مقدمے لکھے ہیں۔ قاضی سجاد حسین کا ترجمہ اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ اس کی عبارت بیحد مختصر، آسان اور مفاہیم کی ترسیل میں دیگر تراجم کی بہ نسبت زیادہ کامیاب ہے۔

قاضی سجاد حسین کا ''ترجمۂ مثنوی معنوی'' 1394ھ مطابق 1974ء سے 1978ء یعنی تقریباً چار برسوں میں مکمل ہوا اور ہندو پاک کے کئی پبلشنگ ہاوسز سے متعدد بار شائع ہوا۔ 80 کی دہائی میں منظر عام پر آنے والا یہ ترجمہ ابھی بھی فارسی زبان و ادب کے طلبا و اساتذہ کے لیے کافی اہم ہے۔ اس ترجمے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی اولین اشاعت کے وقت سے لے کر ابھی تک اردو نظم و نثر میں کئی تراجم منظر عام پر آئے مگر قاضی سجاد حسین کے ترجمے کی مقبولیت ابھی بھی برقرار ہے، بلکہ اس میں مزید اضافہ ہی ہوا ہے اور آج بھی قاضی سجاد حسین کے ترجمے سے استفادے کا چلن عام ہے۔

قاضی سجاد حسین کا ترجمہ بے حد سادہ، عام فہم، سلیس اور رواں ہے، جسے ہر خاص و عام بخوبی پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔ یہ ترجمہ طلبا، اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز کو بہت سی آسانیاں فراہم کراتا ہے۔ قاضی سجاد حسین نے ''مثنوی معنوی'' کے چھ دفاتر کی رعایت کرتے ہوئے اپنے ترجمہ کو بھی چھ جلدوں میں منقسم کیا ہے۔ ہر دفتر کا ترجمہ علاحدہ جلد میں شائع کرایا ہے۔ ترجمہ نگاری میں ایک خاص رعایت یہ برتی گئی ہے کہ ''مثنوی معنوی'' کے ہر سطر کا ترجمہ اسی سطر کے بالکل نیچے لکھ دیا گیا ہے، جس سے قاری کو اصل متن کو سمجھنے میں کافی آسانی ہوجاتی ہے۔

قاضی سجاد حسین نے جلد اول کے مقدمہ میں مولانا رومی کے حالات زندگی کا تفصیل سے احاطہ کیا ہے۔ اس ضمن میں مترجم نے مولانا کا نام ونسب، مولانا کے روحانی پیشوا حضرت شمس تبریزی سے مولانا کی ملاقات، 'ایک مغالطہ اور اس کا ازالہ' کے عنوان سے حضرت شمس تبریزی کے تعلق سے پیدا ہوئیں کچھ غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ مترجم نے مولانا رومی کے روحانی رفیق اور ان کے پہلے خلیفہ شیخ صلاح الدین زرکوب کا مختصر تعارف کرایا ہے، ساتھ ہی مولانا رومی کے خلیفہ اور ''مثنوی معنوی'' کی تخلیق کی اصل وجہ اور داعیہ بننے والے مولانا حسام الدین چلپی کا تعارف، 'مولانا اور فرقہ مولویہ' کے عنوان سے مولانا کی زاہدانہ زندگی اور فرقہ مولویہ یا جلالیہ کے بنیادی اصول وضوابط اور اس کے ماننے والوں کے بارے میں مختصر اور جامع معلومات فراہم کرایا ہے، اسی کے ساتھ فرقہ قلندریہ اور حضرت بوعلی قلندر شاہؒ کا مولانا سے تعلق ونسبت پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے، 'مولانا کی تصانیف' کے عنوان سے مولانا رومی کی کچھ اہم تصانیف مثلاً ''فیہ مافیہ''، مولانا کا دیوان اور ''مثنوی معنوی'' کے بارے میں مختصرا تعارف کرایا ہے، البتہ یہاں مولانا کے خطبات کا مجموعہ ''مجالس سبعہ'' اور ان کے ''مکتوبات'' کا ذکر موجود نہیں ہے۔ ''مثنوی معنوی'' کی شہرت ومقبولیت' کے عنوان سے اس کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، 'چند مفید باتیں' کے ذیل میں سماع کے مسئلہ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے، اس تعلق سے مولانا کے رجحانات کا بھی ذکر ہے، 'وحدت الوجود' اور 'وحدت الشہود' کے عنوان سے نظریۂ وجودی و شہودی کا مفصل احاطہ کیا ہے اور اس بارے میں اکابر واسلاف کے نظریات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ضمنی طور پر اس نظریہ کے روح رواں شیخ محی الدین ابن عربی کا ذکر بھی موجود ہے اور وحدت شہودی کے پیروکار شیخ سعدی کے نظریات کو بھی بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی مترجم نے حضرت مجدد الف ثانی، حضرت بحر العلوم، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، خواجہ شیخ محمد اکرام وغیرہ کے اقوال و آرا بھی قلمبند کیے ہیں۔ علاوہ ازیں اس مقدمہ میں جبر وقدر کے عنوان سے کچھ مفید معلومات بھی فراہم کرائی ہیں۔ 'مثنوی اور فلسفی مسائل' کے عنوان سے ''مثنوی معنوی'' میں موجود فلسفیانہ مسائل مثلا تجاذب اجسام، تجاذب ذرات، تجدد امثال، مسئلہ ارتقا، وجود کے مراتب اور وحی والہام و نبی جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی ہے اور وحی والہام کے بارے میں مولانا کا نظریہ بھی بیان کیا ہے۔

مقدمہ میں تصوف کی کچھ اہم اصطلاحات مثلاً صوفی کسے کہتے ہیں، صوفیا میں 'ابن الوقت' کون

ہوتا ہے؟ 'ابوالوقت' کسے کہتے ہیں؟ 'ابدال' 'نقبا' اور 'رجبی' کون ہوتے ہیں، عالم خلق یا عالم سہو، عالم مثال، عالم امر یا عالم روح، واصل بحق، ولی، اہل ارشاد اور قطب الارشاد، اہل تکوین اور قطب التکوین، لطائف ستہ (صحو، سکر، انبساط، انقباض، محو اور فنا)، ہشت بہشت، ہفت دوزخ، من وسلویٰ، علم احکام، علم لدنی، عہد الست وغیرہ جیسے اہم تصوفانہ اصطلاحات کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

علاوہ ازیں مترجم نے قرآن پاک میں مذکور کچھ مشہور واقعات مثلاً اصحاب کہف، ہاروت و ماروت، اصحاب الاخدود، لیلۃ التعریس، حضرت سلیمانؑ اور ان کی انگوٹھی جیسے دلچسپ اور عبرت آمیز واقعات کو بیان کر کے اس کی ثقاہت واصلیت پر اپنی رائے بھی پیش کی ہے۔ 'مثنوی کی احادیث اور تفسیر' کے عنوان سے ''مثنوی معنوی'' میں شامل احادیث اور قرآن کی کچھ منتخب آیتوں کی تفسیر کے بارے میں علماء ومشائخ کے نظریات کو بھی قلمبند کیے ہیں۔

مترجم نے دفتر اول کے مقدمہ کے اختتام پر مصادر ومراجع کی وضاحت کی ہے، جیسے ''کلید مثنوی'' مولانا اشرف علی تھانوی، ''مفتاح العلوم'' مولانا محمد نذیر عرشی نقشبندی، ''ملفوظات رومی (فیہ ما فیہ)'' مرتبہ عبدالماجد دریا آبادی، ''حکمت رومی'' و'' تشبیہات رومی'' از خلیفہ عبدالحکیم، ''سوانح مولانا روم'' علامہ شبلی نعمانی، ''نقد اقبال'' میکش اکبر آبادی، ''رسالہ سپہ سالار''، ''مرآۃ المثنوی'' قاضی تلمذ حسین، اور ''رود کوثر'' خواجہ شیخ محمد اکرام کا ذکر کیا ہے اور آخر میں مقدمہ کے تکمیل کی تاریخ تحریر کی ہے۔[۴] البتہ مترجم نے اس بات کی وضاحت نہیں کی ہے کہ انھوں نے ترجمہ کے لیے ''مثنوی معنوی'' کے کس نسخے کو بنیاد بنایا ہے۔

دوسری جلد کے مقدمہ میں مولانا اور ''مثنوی معنوی'' کے تعلق سے معروف مولوی شناس اور ہارورڈ یونیورسٹی کی پروفیسر آنا ماری شیمل سے گفتگو پر مبنی کچھ اہم نکات کو شامل کیا ہے۔ علاوہ ازیں مترجم نے 'مولانائے روم کی احادیث وتفسیر اور سیئر صحابہ' کے عنوان سے مولانا عبدالحی لکھنوی کی کتاب ''غایۃ المقال'' اور امام غزالی کی کتاب ''التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ'' کے حوالے سے حضرات صوفیا کی قرآنی تفاسیر کو ہدف تنقید نہ بنانے کا مشورہ دیا ہے۔

اس مقدمہ میں تصوف کی کچھ اہم اصطلاحات مثلاً فتوح، فتح، حس خفاش، حس درپاش، مراقبہ، حضور یار، ظاہر، مظہر، روح، روح اعظم، لاہوت، جبروت، ملکوت، حظیرہ قدس، ملاء اعلیٰ، علم الیقین، عین

الیقین ،حق الیقین ،قطب الاقطاب غوث اعظم وغیرہ کا مختصراً تعارف کرایا ہے۔'شخصیتیں' کے عنوان سے اسلامی تاریخ کے کچھ اہم تاریخی نام جن کا تعلق قرآن واحادیث کی تفسیر یا علم کلام یا دیگر فرقوں کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوسکتے ہیں،ان کا بیان ہے مثلاً سکندر ذوالقرنین،نمرود، جرجیس، سامری، برصیصاء،بلعم بن باعور،عوج بن عنق ،ابوعامر راہب،جعفر طرار، واصل بن عطا اور امام محمد عسکری وغیرہ کا مختصر تعارف کرایا ہے۔'مذہبی فرقے' کے عنوان سے مختلف فرقوں جیسے مشبہ، منزہہ، جامعہ بین التشبیہ والتنزیہہ، معتزلہ، دہریہ، ثنویہ، فرقہ اباحیہ، جبریہ، قدریہ، سوفسطائیہ، عنادیہ، عندیہ اور لاادریہ کے بارے میں کو متعارف کرایا ہے۔[۵]

تیسری جلد کے مقدمہ میں بھی تصوف کی کچھ اہم اصطلاحات مثلاً حیرت، رضا، ابدال، اعیان ثابتہ، عقل معاش، عقل معاد یعنی عقل کلی، عقل کامل یا عارف کی عقل، مستور الحال، الہام، تناسخ اور جسم مثالی وغیرہ کی وضاحت کی ہے۔'واقعات واشخاص' کے ذیل میں صلح حدیبیہ، بنی نضیر، بنی قریظہ، بلال بن رباح، طالوت، حضرت مریمؑ، اہل سبا، حضرت انسؓ، میدان تیہہ، اویس، ابولہب اور اس کی بیوی اور فرعون وموسیٰؑ کے بارے میں اجمالاً ذکر کیا ہے۔[۶]

چوتھی جلد کے مقدمہ میں مترجم نے اپنے دورۂ قونیہ کی روداد بیان کی ہے اور پھر مذکورہ دفتر سے متعلق کچھ اہم معلومات و اصطلاحات مثلاً طی الارض، لطائف عشرہ، تجدد امثال، مسئلہ سماع، مسجد اقصیٰ، مسجد حرام، حلیمہ سعدیہ، بایزید بسطامی، ابوالحسن خرقانی، شق صدر، حطیم اور ہابیل وقابیل کے بارے میں مختصر ذکر کیا ہے۔[۷] پانچویں جلد کے مقدمہ کا آغاز اس دفتر سے متعلق بعض مباحث سے ہوتا ہے جس میں نفس امارہ، لوامہ، مطمئنہ اور ملہمہ اور ان کی تعریفات، انسان کی تین طاقتیں (ملکی، سبعی اور بہیمی اور ان کی تعریفات)، وقوف قلبی، کرامت کی قسمیں (حسی اور معنوی اور ان کی تعریفات)، فیض اقدس اور فیض مقدس اور ان کی تعریفات، معیت حق (عامہ اور خاصہ اور ان کی تعریفات)، علم باری تعالیٰ، معجزہ رد الشمس، عشرہ مبشرہ، حدیث لولاک، عباس دبس، اصحاب فیل، قوم لوط، اہل انطاکیہ، اصحاب سبت، عمر بن عبدالعزیز، حجاج بن یوسف، ابوہریرہؓ، محمد خوارزمشاہ، روح، استدراج اور نحس اکبر و سعد اکبر کے بارے میں اجمالی معلومات فراہم کرائی ہیں۔[۸]

مترجم نے چھٹی یعنی آخری جلد کے مقدمہ میں چھٹے دفتر کے مکمل یا نامکمل رہ جانے کے بارے

میں اختلافات کی طرف اشارہ کیا ہے اور مولانا کی پیشین گوئی والے شعر کی تقلید میں چھٹے دفتر کا تکملہ لکھنے والے حضرات بالخصوص حضرت مفتی الٰہی بخشؒ اور شیخ محمد تھانوی (ان سے مراد مولانا اشرف علی تھانوی نہیں ہیں بلکہ یہ میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی کے مجاز اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے پیر بھائی تھے) کا ذکر کیا ہے، اس کے بعد اس دفتر میں شامل کچھ اہم اصطلاحات کا مختصر اتعارف کرایا ہے، مثلاً: ہمت، توحید فی الذات، توحید فی الصفات، توحید فی الافعال، مراقبہ موت، عروج ونزول، عمل خطائین، جبر وقدر، عبادت تسخیری وتشریعی، عالم خلق وامر، قلہ، بیت المعمور، قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ابوالقاسم عبدالکریم بنی ہوازن القشیری، ابوطالب مکی، اصحاب ایکہ، زرتشت، امرءالقیس، کیخسر وصفورا، **حبک الشیء یعمی و یصم، موتوا قبل ان تموتوا، نوم العالم عبادۃ، ان السیف محاء للخطایا، ما وسعنی ارضی و لاسمائی ولکن وسعنی قلب عبدی المؤمن، وحدت الوجود، وحدت الشہور** اور غیبت وغیرہ کی وضاحت کی ہے۔ مقدمہ کے آخر میں ۲۳ رجون ۱۹۷۸ء کی تاریخ رقم ہے۔ اس طرح ان دفاتر کے ترجمہ کرنے کی تاریخ وتکمیل کا پتہ چل جاتا ہے۔[۹]

اس طویل مقدمہ کے بعد اصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔ قاضی سجاد حسین کے ترجمے کا انداز بالکل انوکھا اور نرالا ہے، یہ ترجمہ نثر میں ہے جو ''مثنوی معنوی'' کے اشعار کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ ترجمہ میں اختصار کے ساتھ تسلسل وجامعیت بھی ہے۔ ہر شعر کا ترجمہ دوسرے شعر سے مربوط ہے۔ یہ خاص وصف ان اشعار میں اور بھی نمایاں ہوجاتا ہے جہاں وہ کسی حکایت کا ترجمہ کررہے ہوتے ہیں۔ سطور ذیل میں قاضی سجاد حسین کے ترجموں کے کچھ نمونے پیش کیے جارہے ہیں۔

اہل اللہ کے عمل کو خود پر قیاس نہ کرو

''مثنوی معنوی'' کے دفتر اول میں مولانا رومیؒ **حکایت مرد بقال و طوطی و روغن ریختن طوطی در دکان** ' کے زیر عنوان ایک بنیا اور اس کی طوطی کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک بنیا کی دکان پر ایک طوطی رہتی تھی جو گراہکوں کی تفریح طبع کے لیے کچھ اچھی اچھی باتیں ذہن نشین کرکے اسے دہرایا کرتی تھی اور گراہک اس کی چکنی چپڑی باتوں اور شوخ اداؤں سے متاثر ہوکر کھنچے چلے آتے تھے۔ اتفاقاً بنیا کسی کام سے باہر چلا جاتا ہے اور دکان میں صرف وہی طوطی رہ جاتی ہے

جو دکان کی نگرانی کرتی ہے، اتنے میں ایک بلی ایک چوہے پر جھپٹتی ہے، یہ ماجرا دیکھ کر طوطی حواس باختہ ہوکر بھاگنے لگتی ہے، جس سے بنیا کا سارا تیل زمین پر گر جاتا ہے، بنیا جب دکان میں آ کر سارا ماجرا دیکھتا ہے تو پھر کیا ہوتا ہے؟ یہی باتیں ''مثنوی معنوی'' کے اشعار میں مذکور ہیں۔ ذیل کے اشعار دیکھیں اور قاضی سجاد حسین کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

بود بقّالی مر او را طوطیٔ
خوشنوا و سبز و گویا طوطیٔ
بر دکان بودی نگہبانِ دکان
نکتہ گفتی باہمہ سوداگران
درخطاب آدمی ناطق بدی
در نوای طوطیان حاذق بدی
خواجہ روزی سوی خانہ رفتہ بود
در دکان طوطی نگہبانی نمود
گربۂ بر جست ناگہ در دکان
بہرِ موشی، طوطیک از بیم جان
جست از صدرِ دکان بہرِ گریخت
شیشہ ہایِ روغن گل را بریخت
از سوی خانہ بیامد خواجہ اش
بر دکان بنشست فارغ شاد و خوش
دید پر روغن دکان و جامہ چرب
بر سرش زد، گشت طوطی کل ز ضرب
روز کے چندی سخن کوتاہ کرد
مرد بقال از ندامت آہ کرد
ریش برمی کند و می گفت ای دریغ

کافتاب نعمتم شد زیر میغ
دست من بشسکتہ بودی آن زمان
کہ زدم من بر سر آن خوش زبان
ہدیہ ہا میداد ہر درویش را
تا بیابد نطق مرغ خویش را
بعد سہ روز و سہ شب حیران و زار
بر دکان بنشستہ بد نومیدوار
با ہزاران غصہ و غم گشتہ جفت
کای عجب این مرغ کی آید بگفت
می نمود آن مرغ را ہرگون شگفت
وز تعجب لب بدندان می گرفت
دمبدم می گفت با او ہر سخن
تاکہ باشد کاندر آید در سخن
بر امید آنکہ مرغ آید بگفت
چشم او را با صور می گرد جفت
ناگہانی جولقی می گذشت
با سر بی مو چو پشت طاس و طشت
طوطی اندر گفت آمد آن زمان
بانگ بر رویش زدہ چون عاقلان
کز چہ ای کل با کلان آمیختی
تو مگر از شیشہ روغن ریختی
از قیاسش خندہ آمد خلق را
کو چو خود پنداشت صاحب دلق را

کار پاکان را قیاس از خود مگیر
گرچہ باشد در نوشتن شیر شیر
شیر آن باشد کہ مرد او را خورد
شیر آن باشد کہ مردم را درد
جملہ عالم زین سبب گمراہ شد
کم کسی زابدال حق آگاہ شد

ترجمہ: ''ایک بنیا تھا اور اس کی ایک طوطی تھی جو خوش آواز، سبز رنگ اور بولنے والی طوطی تھی (یہ طوطی) دکان پر دکان کی حفاظت کرتی تھی اور تمام سوداگروں سے دلچسپ باتیں کرتی تھی۔ وہ آدمیوں سے خطاب کرنے میں ان جیسی باتیں کرتی تھی اور طوطیوں کے ساتھ نوا سنجی میں ماہر تھی۔ مالک ایک دن اپنے گھر کو گیا تھا، طوطی دکان کی حفاظت کر رہی تھی۔ اچانک ایک بلی دکان میں کودی، ایک چوہے کے لیے اور بیچاری طوطی اپنی جان کے خوف سے بھاگنے کے لیے دکان کے بیچ میں کودی اور روغن گل کی شیشیاں بہادیں۔ اس کا مالک گھر سے (واپس) آیا، (اور) خوش خوش، اطمینان سے دکان پر بیٹھ گیا۔ (لیکن) دکان کو تیل سے پر اور کپڑوں کو چکنا دیکھ کر، اس کے سر پر ایسی مار لگائی کہ طوطی گنجی ہوگئی۔ چند دن تک (طوطی) نے بات کرنی چھوڑ دی، بنیے نے ندامت وافسوس سے آہ کی۔ (وہ اپنی) داڑھی کو نوچتا اور کہتا تھا، ہائے افسوس، میری نعمت کا سورج بدلی میں آ گیا۔ اس وقت میرے ہاتھ ٹوٹ گئے ہوتے، جب میں نے اس خوش زبان (طوطی) کے سر پر ضربیں ماری تھیں۔ وہ ہر فقیر کو تحفے تقسیم کر رہا تھا، تاکہ اپنی طوطی کی گویائی کو پالے۔ تین دن اور تین رات کے بعد حیران و بدحال، مایوسی کی حالت میں دکان پر بیٹھا تھا۔ ہزاروں رنج اور غم میں مبتلا، ہائے تعجب! یہ طوطی کب بولے گی؟ ہر قسم کی

انوکھی چیزیں اس پرندہ کو دکھاتا تھا، اور پھر تعجب سے اپنے ہونٹ کاٹتا تھا۔ ہر وقت اس سے طرح طرح کی باتیں کرتا تھا، کہ شاید وہ باتیں کرنے لگے۔ اس امید پر کہ پرندہ بول پڑے، (مختلف قسم کی) تصویریں اسے دکھاتا۔ اتفاقاً ایک گدڑی پوش ادھر سے گزر رہا تھا، جس کا سر پرات اور طشت کی پشت کی طرح (بالوں سے صاف) تھا۔ طوطی (اس کو دیکھ کر) فوراً بول پڑی، اس کو پکارا اور عقلمندوں کی طرح (سوال کیا)۔ اے گنجے! تو گنجوں میں کیوں شامل ہوا؟ شاید تو نے بھی شیشی سے تیل گرایا ہے۔ اس کے اس قیاس سے لوگ ہنس پڑے، کہ اس نے گدڑی والے کو اپنا جیسا سمجھا۔ پاک لوگوں کے کام کو اپنے پر قیاس نہ کر، اگرچہ لکھنے میں شیر (درندہ) اور شیر (دودھ) یکساں ہوتا ہے۔ شیر تو وہ ہے جس کو آدمی پیتا ہے، اور شیر وہ ہے جو آدمیوں کو پھاڑتا ہے۔ اس وجہ سے پورا عالم گمراہ ہو گیا، بہت کم کوئی خدا کے ابدال سے واقف ہوا۔[۱۰]

ترجمہ کے مطالعہ سے صورت واقعہ ہو بہو ہمارے سامنے منعکس ہو جاتا ہے۔ کہیں سے کوئی شبہ یا انقطاع کا احساس نہیں ہوتا، ترجمہ میں تسلسل اور جملوں کے مابین ربط ہے جو مفہوم کو واضح کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔ ترجمہ میں اجمال بھی ہے یعنی بین قوسین میں لمبی چوڑی عبارت نہیں ہے، جو کسی بھی ترجمہ کی خوبی میں شامل ہے۔ ترجمہ کی عبارت اس کے متن کے مساوی سانچے میں رکھی گئی ہے، جو لازمی طور پر متن کی عبارت کے تقریباً مساوی ہے اور غیر ضروری اضافیات و بین قوسین کی لمبی چوڑی عبارت سے بھی پاک ہے۔

''مثنوی معنوی'' کے دفتر اول میں 'سوال کردن خلیفه از لیلی و جواب او' کے عنوان کے ذیل میں ''مثنوی معنوی'' کے اشعار اور قاضی سجاد حسین کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

گفت لیلی را خلیفه کان تویی
کز تو مجنون شد پریشان و غوی
از دگر خوبان تو افزون نیستی

گفت خامش چون تو مجنون نیستی
دیدۂ مجنون اگر بودی ترا
ہر دو عالم بی خطر بودی ترا
با خودی تو لیک مجنون بیخودست
در طریق عشق بیداری بدست
ہر کہ بیدار ست او در خواب تر
ہست بیداریش از خوابش بتر

ترجمہ: ''خلیفہ نے لیلیٰ سے کہا، کیا تو وہی ہے کہ تیری وجہ سے مجنوں پریشان اور دیوانہ ہوا ہے؛ تو دوسرے حسینوں سے بڑھ کر تو نہیں ہے، اس نے کہا خاموش رہ، چونکہ تو مجنوں نہیں ہے؛ اگر تیرے پاس مجنوں کی آنکھ ہوتی، تو تیرے لیے دونوں جہاں بے قدر ہوتے؛ تو ہوش میں ہے لیکن مجنوں بے ہوش ہے، عشق کی راہ میں بیداری بری چیز ہے؛ جو بیدار ہے، وہ زیادہ نیند (غفلت) میں ہے، اس کی بیداری، نیند سے بدتر ہے۔'' (۱۰۔الف)

مذکورہ بالا ترجمہ کو پڑھ کر صورت مسئلہ اور خلیفہ و لیلیٰ کے مابین کیا گیا مکالمہ بحسن وخوبی ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

''مثنوی معنوی'' کے دفتر اول میں ہی 'بازترجیح نهادن شیر جهد را بر توکل و تسلیم' کے عنوان کے ذیل میں 'کوشش اور توکل' کے مکالمہ کو ایک شیر اور شکار کے جانوروں کی زبانی بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس میں شیر حدیث کی روشنی میں 'کوشش' کو 'توکل' پر ترجیح دیتا ہے، ملاحظہ کریں ذیل کے یہ اشعار:

گفت آری گر توکل رہبرست
این سبب ہم سنت پیغمبرؐ ست
گفت پیغمبرؐ بآوازِ بلند
برتوکّل زانوی اُشتر بہ بند

رَمزِ اَلکاسِب حَبیب اللہ شنو
از تَوکُّل در سبب کاہل مشو
درتو کُّل کسب و جہد اولیٰ ترست
تا حبیب حق شوی این بہترست
رو توکل کن تو باکسب ای عمو
جہد می کن کسب می کن مو بمو
جہد کن جِدّی نما تا وارہی
گر تو از جہدش بما نی ابلہی

اب قاضی سجاد کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

''اس نے کہا بیشک اگر چہ توکل راہ نما ہے، یہ سبب (اختیار کرنا) بھی پیغمبرؐ کی سنت ہے؛ پیغمبرؐ نے بلند آواز سے کہا ہے، توکل کے ساتھ اونٹ کے گھٹنے باندھ دو؛ 'الکاسب حبیب اللہ' کا نکتہ سنو، توکل کی وجہ سے سبب کے معاملہ میں سست نہ بنو؛ توکل میں کمائی اور کوشش زیادہ بہتر ہے، تاکہ تو اللہ کا محبوب بن جائے، یہ بہتر ہے؛ اے چچا! جا، مع کوشش کے توکل کر، کوشش کر، کمائی کر، سربسر؛ کوشش کر، تن دہی کر، تاکہ نجات پائے، اگر تو اس کی کوشش سے باز رہا تو بیوقوف ہے۔''[۱۱]

مذکورہ بالا اشعار میں 'گفت پیغمبرؐ بآوازِ بلند الخ' کا ترجمہ 'پیغمبر نے بلند آواز سے کہا توکل کے ساتھ اونٹ کے گھٹنے باندھ دو' کے بجائے اگر یوں ہوتا کہ 'پیغمبرؐ نے علی الاعلان کہا کہ توکل کے ساتھ ساتھ اونٹ کے گھٹنے بھی باندھ دیا کرو' تو بغیر عبارت کی طوالت کے مفہوم کی بہتر ترسیل ہوسکتی تھی۔

اسی طرح ''مثنوی معنوی'' کا یہ شعر 'در توکل کن تو باکسب ای عمو الخ' کا ترجمہ 'اے چچا! جا، مع کوشش کے توکل کر' کے بجائے اگر 'اے چچا! جاؤ، کوشش کے ساتھ توکل کرو، محنت کرو اور خوب کماؤ' ترجمہ کیا جاتا تو عبارت میں مزید ادبیت کے ساتھ ساتھ متن کے مافیہ کی بہترین ترجمانی

ہوسکتی تھی۔ساتھ ہی ترجمے کی عبارت میں جوایک اشتباہ پیدا ہورہا ہے'اے چچا! جا،مع کوشش کے توکل کر'وہ بھی رفع ہوجاتا۔

اسی واقعہ سے مربوط

باز ترجیح نہادن شیر جہد را
بر توکل و فوائد جہد بیان کردن

کے عنوان کے تحت لکھے گئے کچھ مزید اشعار کا ذکر ہے،جس میں شیر نہ صرف جدوجہد کی ترغیب دیتا ہے بلکہ اسی کے ساتھ کوشش کرنے کے فوائد کو بھی بیان کرتا ہے،اب ذیل کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

شیر گفت آری و لیکن ہم ببین
جہد ہای انبیا و مرسلین
سعی ابرار و جہاد مومنان
تابدین ساعت ز آغاز جہان
حق تعالیٰ جہدشان جملہ حال آمد لطیف
کل شیء من ظریف ہو ظریف
دامہاشان مرغ گردونی گرفت
نقصہاشان جملہ افزونی گرفت
جہد میکن تاتوانی ای کیا
در طریق انبیا و اولیا
با قضا پنجہ زدن نبود جہاد
زانکہ این را ہم قضا برما نہاد

اب قاضی سجاد حسین کا ترجمہ دیکھیں:

''شیر نے کہا درست ہے،لیکن یہ بھی تو دیکھ،انبیا اور رسولوں کی کوششیں۔ نیکوں کی کوشش،مومنوں کا جہاد،ابتدائے آفرینش سے اب تک۔اللہ نے ان کی کوشش درست کردی، جو کچھ انھوں نے ظلم اور گرم وسرد دیکھا۔

بہرحال ان کی تدبیریں، پاکیزہ ثابت ہوئیں، بھلے کی ہر شے بھلی ہوتی ہے۔ان کے جالوں نے آسمانی پرندے پکڑے، ان کی تمام کمیوں نے، ترقیاں حاصل کرلیں۔اے عقلمند! جس قدر بھی ہوسکے کوشش کر، انبیا اور اولیا کے طریقہ پر۔ جہاد، تقدیر الٰہی کا مقابلہ نہیں ہے، اس لیے کہ یہ بھی تقدیر الٰہی نے ہم پر رکھا ہے۔''[۱۲]

مذکورہ بالا اشعار کا ترجمہ متن کے عین مطابق ہونے کے ساتھ فن ترجمہ نگاری کے رہنما اصولوں کی رعایت کرتے ہوئے کیا گیا ہے۔اس ترجمہ سے پورے مکالمے کی بہت حد تک ترجمانی ہوجاتی ہے۔علاوہ ازیں ترجمے کی عبارت رواں، سادہ اور مربوط ہے جس کی وجہ سے مفہوم کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی۔اسے ایک بہتر ترجمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

وجود کی خوشبو

مولانا رومی نے باطن کی توانائی اور وجود کی خوشبو کا احساس کئی طریقوں سے دلایا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جس طرح ہرن کا بچہ پہلے پہل ماں کی رہنمائی کا محتاج ہوتا ہے مگر بعد میں اس کا نافہ خود اس کا رہنما بن جاتا ہے، اسی طرح انسان جب اپنے وجود کی بو پالیتا ہے تو یہ خوشبو ہی اس کی رہنما بن جاتی ہے۔

چند گاہش گام آہو درخورست
بعد ازان خود ناف آہو رہبرست
چونکہ شکر گام کرد و رہ برید
لاجرم زاں گام در کامی رسید
رفتن یک منزلی بر بوئی ناف
بہتر از صد منزل گام وطواف

ترجمہ: اس کو کچھ دن ہرن کے قدموں کی ضرورت ہے، اس کے بعد خود ہرن کا نافہ اس کا رہنما ہے۔چونکہ اس نے نشان قدم کی قدر کی اور راستہ

طے کیا، لامحالہ اس قدم سے مقصد تک پہنچ گیا۔ نافہ کی خوشبو پر ایک منزل چلنا، چکر کی سو منزلوں سے بہتر ہے۔[۱۳]

اپنے وجدان پر اعتماد ضروری ہے، وجود کی خوشبو کا کوئی نعم البدل نہیں۔ مولانا رومی کہتے ہیں کہ نافہ کی خوشبو پر ایک منزل چلنا، چکر کی سیکڑوں منزل چلنے سے کہیں بہتر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وجود کی خوشبو مخلوق کو اپنے خالق سے قریب تر کرتی ہے، وہ اپنے قلب میں مخفی خوشبو کے ذریعہ اپنے خالق تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ اسی خوشبو کے ذریعہ معرفت کے دریچے کھلتے ہیں، پھر جو چیز ہم آئینہ کے ذریعہ دیکھتے ہیں، ایک عارف اسے ایک لوہے کے ٹکڑے کے ذریعہ بہت پہلے دیکھ لیتا ہے، کیونکہ یہ قلب بے شمار انوار و بصیرت کا سرچشمہ ہوتا ہے۔

آن دلی کو مطلع مہتابہا ست
بہر عارف 'فتحت ابوابہا' ست
با تو دیوارست و با ایشان درست
با تو سنگ و با عزیزان گوہر ست
آنچہ تو در آئینہ بینی عیان
پیر اندر خشت بیند پیش ازان
پیر ایشانند کاین عالم نبود
جان ایشان بود در دریای جود
پیش ازین تن عمرہا بگذاشتند
پیشتر از کشت بر برداشتند
پیشتر از نقش جان پذرفتہ اند
پیشتر از بحر درہا سفتہ اند

ترجمہ: وہ دل جو بہت سورجوں کا مشرق ہے، عارف کے لیے 'فتحت ابوابہا' (کا مصداق) ہے۔ (وہ دل) تیرے لیے دیوار اور ان کے لیے دروازہ ہے، تیرے لیے پتھر اور پیاروں کے لیے موتی ہے۔ تو جو کچھ آئینہ میں

مشاہدہ کرتا ہے، پیر، لوہے کے ٹکڑے میں اس سے پہلے دیکھ لیتا ہے۔ وہ اس وقت سے پیر ہیں جب کہ یہ جہان نہ تھا، ان کی روحیں دریائے حق میں تھیں۔ اس جسم سے پہلے انھوں نے عمریں گزاری ہیں، انھوں نے کھیتی سے پہلے ہی پھل چنے ہیں۔ وہ جسم سے پہلے جان حاصل کر چکے ہیں، دریا سے پہلے ہی وہ موتی پرو چکے ہیں۔[۱۴]

بصیرت کے بغیر بصارت بیکار ہے

مثنوی معنوی میں مذکور 'ترسانیدن شخصی زاهدی را که کم گریی تاکور نشوی' کے عنوان کے تحت مولانا رومی ایک واقعہ بیان کر رہے ہیں کہ ایک زاہد اپنے اہل طریقت دوست کو نصیحت کر رہا ہے کہ 'گریہ وزاری کم کیا کرو ورنہ تمہاری آنکھیں بیکار ہو جائیں گی۔ اس پر وہ اہل طریقت دوست کہتا ہے کہ میری حالت دو کیفیات سے خالی نہیں۔ یا تو ان آنکھوں سے اپنے خالق کا دیدار ہوگا یا نہیں۔ اگر دیدار ہو جائے تو نور خالق کے سامنے میری ان آنکھوں کا نور ہیچ ہے اور اگر دیدار نہ ہو سکا تو پھر ایسی آنکھوں کے ہونے کا کیا فائدہ جس سے خالق کا دیدار ہی نہ ہو سکے۔' اب ''مثنوی معنوی'' کے اشعار اور اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

زاہدی را گفت یارے در عمل
کم گریی تا چشم را ناید خلل
گفت زاہد از دو بیرون نیست حال
چشم بیند یا نبیند آن جمال
گر ببیند نور حق خود چہ غم ست
در وصال حق دو دیدہ کی کم ست؟
ور نخواہد دید از نور و ضو
این چنین چشم شقی گو کور شو
غم مخور از دیدہ کان عیسیٰ تراست

چپ مرو تا بخشدت او چشم راست
عیسیٰ روح تو باتو حاضرست
نصرت ازوی خواہ کو خوش ناصرست
لیک بیگار تن پر استخوان
بر دل عیسیٰ منہ تو ہر زمان
ہمچو آن ابلہ کہ اندر داستان
ذکر او کردیم بہر راستان
زندگی تن مجو از عیسیت
کام فرعونی مخواہ از موسیت

اب قاضی سجاد حسین کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

''عمل (تصوف) کے ایک ساتھی نے ایک زاہد سے کہا، کم رویا کر، تا کہ آنکھ کو نقصان نہ پہنچے۔ زاہد نے کہا، حال دو صورتوں سے خالی نہیں ہے، اس حسن کو آنکھیں دیکھیں گی یا نہ دیکھیں گی۔ اگر وہ اللہ (تعالیٰ) کے نور اور روشنی کو دیکھ لیں گی تو پھر کیا غم ہے؟ اللہ (تعالیٰ) کے وصال میں دو آنکھیں کیا کم ہیں۔ اور اگر وہ اللہ (تعالیٰ) کے نور اور روشنی کو نہ دیکھ سکیں گی، تو کہہ دو، ایسی آنکھیں اندھی ہو جائیں۔ آنکھوں کی فکر نہ کر، عیسیٰ (خدا) تیرا ہے، ٹیڑھا نہ چل، تا کہ وہ تجھے صحیح آنکھیں بخش دے۔ تیری روح کا عیسیٰ (خدا) تیرے پاس موجود ہے، مدد اس سے مانگ، وہ بہترین مددگار ہے۔ لیکن ہڈیوں بھرے جسم کی بیگار، کسی وقت (بھی) عیسیٰ (خدا) کے دل پر نہ رکھ۔ اس بیوقوف کی طرح جس کے قصہ میں، اہل حق کے لیے ہم نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اپنے عیسیٰ (خدا) سے جسم کی زندگی کا طالب نہ بن، اپنے موسیٰ (خدا) سے فرعونی مقصد نہ چاہ۔''[۱۵]

مذکورہ بالا اشعار کا ترجمہ مناسب ہے۔ لیکن اس شعر 'گر ببیند نور حق خود چہ

غم ست؛در وصال حق دو دیدہ کی کم ست؟' کے دوسرے مصرعہ کا ترجمہ اپنے مفہوم کی ادائیگی میں اغلاق پیدا کر رہا ہے۔ مذکورہ شعر کا دوسرا مصرعہ مثنوی کے دوسرے نسخوں میں یوں ہے: 'در وصال حق دو دیدہ چہ کم ست؟' مترجم نے بھی اس کا ترجمہ 'چہ کم ست' کے مطابق کیا ہی ہے۔ لیکن ترجمہ کرنے کے انداز سے مفہوم کی کما حقہ ترسیل نہیں ہو پائی ہے۔ مترجم اس شعر کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ: 'اگر وہ اللہ (تعالیٰ) کے نور اور روشنی کو دیکھ لیں گی تو پھر کیا غم ہے؟ اللہ (تعالیٰ) کے وصال میں دو آنکھیں کیا کم ہیں۔' جب کہ اس کا ترجمہ اگر یوں ہوتا کہ 'اگر وہ اللہ (تعالی) کے نور اور روشنی کو دیکھ لیں گی تو پھر کیا غم ہے؟، اللہ تعالی کے وصال والی دو آنکھیں، کیا کم ہیں؟' تو مفہوم کی بہترین ترسیل ہو سکتی تھی۔

عیب جوئی کے بجائے خود احتسابی کرو

''مثنوی معنوی'' کے دفتر دوم میں مذکور 'حکایت ہندو کہ با یاران خود جنگ می کرد کہ بدکارید و خبرنداشت کہ خود نیز بدان مبتلاست' کے عنوان کے تحت مولانا رومی حضورؐ کی حدیث کی تشریح فرماتے ہیں، یہ عنوان گنجور پر 'بخش ۸۵ – حکایت ہندو کی با یاد خود جنگ می کرد بر کاری و خبر نداشت کی او ہم بدان مبتلاست' مرقوم ہے۔

مولانا رومی فرماتے ہیں کہ 'دوسروں کی عیب جوئی کرنے والے اکثر و بیشتر خود گمرہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس تعلق سے مولانا رومی ایک واقعہ بیان کر کے اسے مثال سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ چار ہندوستانی کسی سفر پر جاتے ہیں کہ اچانک سفر میں کسی مقام پر نماز کا وقت آن پڑتا ہے۔ سبھی مسافر علاحدہ علاحدہ نماز پڑھنی شروع کر دیتے ہیں۔ اتنے میں مؤذن بھی آ جاتا ہے۔ مؤذن کو دیکھ کر ان میں سے ایک نمازی کہتا ہے کہ 'موذن صاحب! اذان کا وقت تو ہو گیا ہے، آپ نے ابھی تک اذان نہیں دی؛ یہ دیکھ کر دوسرا نمازی کہتا ہے کہ دوران نماز کلام کرنے کی وجہ سے تمہاری نماز فوت ہو گئی؛ تیسرا نمازی دوسرے نمازی کو تنبیہ کرتا ہے کہ تم دوسروں کو نصیحت کر رہے ہو اور خود بات کر رہے ہو؛ یہ دیکھ کر چوتھے نمازی کے اندر احساس برتری پیدا ہوتی ہے اور وہ ان تینوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے؛ خدا کا شکر ہے کہ ان تینوں کی طرح میری نماز ضائع نہیں ہوئی۔ اس

طرح ان میں سے سبھوں کی نمازیں باطل ہوجاتی ہیں۔اب ذرا ''مثنوی معنوی'' کے اشعار اور اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

چار ہندو در یکی مسجد شدند
بہر طاعت راکع و ساجد شدند
ہر یکی بر نیتی تکبیر کرد
در نماز آمد بہ مسکینی و درد
موذن آمد زان یکی لفظی بجست
کای موذن بانگ کردی وقت ہست
گفت آن ہندوی دیگر از نیاز
ہی سخن گفتی و باطل شد نماز
آن سوم گفت آن دوم را کای عمو
چہ زنی طعنہ باو خود را بگو
آن چہارم گفت حمد اللہ کہ من
در نیفتادم بچہ چون این سہ تن
پس نماز ہر چہاران شد تباہ
عیب جویان بیشتر گم کردہ راہ
ای خنک جانی کہ عیب خویش دید
ہرکہ عیبی گفت آن بر خود گزید
زانکہ نیمی او زعیبستان بدست
وان دگر از وی ز غیبستان بدست
چونکہ بر سر مر ترا صد ریش ہست
مرہمش بر خویش باید کاربست
عیب کردن ریش را داروی اوست

چون شکستہ گشت جای 'ارحـــمـــوا' است
گر ہمان عیبت نبود ایمن مباش
بو کہ آن عیب از تو گردد نیز فاش
'لاتـــخـــافـــوا' از خدا نشنیدۂ
پس چہ خود را ایمن و خوش دیدۂ

''چار ہندوستانی ایک مسجد میں پہنچے، عبادت کے لیے رکوع اور سجدے میں گئے۔ ہر ایک نے ایک نیت کر کے تکبیر کہی، مسکینی اور درد کے ساتھ نماز میں لگ گیا۔ موذن آیا، ان میں سے ایک کی زبان سے یہ لفظ نکلا، اے موذن! تو نے اذان دے دی؟ وقت ہوگیا ہے۔ دوسرے ہندوستانی نے لجاجت سے کہا، ہائے! تو نے بات کرلی اور نماز ٹوٹ گئی۔ تیسرے نے دوسرے سے کہا، اے چچا! اس کو کیا طعنہ دیتا ہے، خود کو دے۔ چوتھا بولا، خدا کا شکر ہے کہ میں، ان تینوں کی طرح، کنویں میں نہیں گرا۔ تو چاروں کی نماز برباد ہوئی، عیب جو خود زیادہ گمراہ ہوئے۔ قابل مبارک باد ہے وہ شخص جو اپنا عیب دیکھے، جو کوئی عیب بتائے، اپنے لیے تسلیم کرلے۔ کیونکہ اس کا آدھا، عیبوں کی دنیا کا ہے، دوسرا (آدھا) عالم غیب کا ہے۔ چونکہ تیرے سر پر سو زخم ہیں، ان کا مرہم اپنے اوپر لگانا چاہیے، زخم کو برا سمجھنا (ہی) اس کا علاج ہے، جب خاکسار بن گیا 'ارحموا' کا محل ہے۔ اگر وہ عیب تجھ میں نہیں ہے تو (بھی) مطمئن نہ ہو، ہوسکتا ہے کہ وہ عیب تجھ میں ظاہر ہوجائے۔ تو نے خدا سے 'نہ ڈرو' نہیں سنا ہے، تو اپنے آپ کو مطمئن اور بھلا کیوں سمجھتا ہے؟''[۱۶]

قاضی سجاد حسین کا ترجمہ مختصر اور مناسب ہے، لیکن کہیں کہیں پر علاقائی لہجہ غالب آجانے کی وجہ سے مفہوم کی کماحقہ ترسیل نہیں ہو پائی ہے مثلاً دوسرے شعر کے دوسرے مصرعہ کا ترجمہ اگر چہ متن کے عین مناسب ہے، لیکن مفہوم کی تفہیم میں موزوں نہیں ہو پایا ہے۔ اگر یہ ترجمہ 'ہر ایک نے ایک نیت

کر کے تکبیر کہی، مسکینی اور درد کے ساتھ نماز میں لگ گیا۔' کے بجائے یوں ہوتا کہ 'ہر ایک نے تکبیر کہہ کے نیت باندھ لی، خشوع وخضوع کے ساتھ نماز میں لگ گیا' کیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوسکتا تھا۔

اسی طرح پانچویں شعر کا ترجمہ اگر 'تیسرے نے دوسرے سے کہا، اے چچا! اس کو کیا طعنہ دیتا ہے، خود کو دے۔' کے بجائے اس طرح کریں کہ 'تیسرے نے دوسرے سے کہا، اے چچا! اسے کیا طعنہ دیتے ہو، خود کو بھی تو کوسو۔' تو مفہوم کی بہتر ادائیگی ہوسکتی تھی۔

اسی طرح ساتویں شعر کا ترجمہ اگر 'تو چاروں کی نماز برباد ہوئی، عیب جو خود زیادہ گمراہ ہوئے۔' کے بجائے اس طرح ہوتا 'لہذا چاروں میں سے ہر ایک کی نماز باطل ہوگئی، عیب جوئی کرنے والے اکثر گمراہ ہوگئے۔' تو بہتر اور مختصر ہونے کے ساتھ مفہوم کی ترسیل میں بھی کامیاب ہوجاتا۔ بہرحال مجملہ طور پر مذکورہ بالا اشعار کا ترجمہ مختصر ہے اور متن کے مطابق ہے۔

مسجد کے احترام سے زیادہ اہل اللہ کے دل کا خیال ضروری

مولانا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مسجد سے زیادہ اہل دل کا احترام ضروری ہے، وہ لوگ بیوقوف ہیں جو مسجد کا احترام کرتے ہیں اور اہل اللہ کی دل شکنی سے باز نہیں آتے۔ ذیل میں مذکور ''مثنوی معنوی'' کے اشعار ملاحظہ کریں:

ابلہان تعظیم مسجد می کنند
در صفای اہل دل جد می کنند
آن مجازست این حقیقت ای خران
نیست مسجد جز درون سروروان
مسجدی کان اندرون اولیاست
سجدہ گاہ جملہ است آنجا خداست
تا دل مرد خدا نامد بہ درد
ہیچ قومی را خدا رسوا نکرد
قصد جنگ انبیا می داشتند

جسم دیدند آدمی پنداشتند
در تو ہست اخلاق آن پیشینیان
چون نمی ترسی کہ باشی تو ہمان
عادت آن ناسپاسان در تو رست
نایدت ہر بار دلو از چہ درست

''بیوقوف مسجد کی تعظیم کرتے ہیں، اہل دل پر ظلم کے کوشاں ہیں۔ اے گدھو! وہ مجاز ہے، یہ حقیقت ہے، بزرگوں کے دل کے علاوہ مسجد (اور کچھ) نہیں ہے۔ وہ مسجد جو اولیا کے باطن میں ہے، وہ سب کی سجدہ گاہ ہے، خدا اس میں ہے۔ جب تک مرد خدا کے دل کو تکلیف نہیں پہنچی، خدا نے کسی قوم کو رسوا نہیں کیا۔ انھوں نے انبیا سے لڑائی کا ارادہ کیا، انھوں نے (صرف) جسم دیکھا (صرف) آدمی سمجھا۔ تیرے اندر ان پہلی قوموں کے اخلاق ہیں، تو کیوں نہیں ڈرتا کہ تو بھی ویسا ہی ہو جائے گا۔ تیرے اندر ان ناشکروں کی عادت پیدا ہوگئی ہے، ہر بار ڈول کنویں سے درست نہیں نکلتا ہے۔''[۱۷]

دنیا کی حقیقت

مولانا رومی دنیا کی ناپائیداری اور اس کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ذرہا دیدم دہان شان جملہ باز
گر بگوئیم خورد شان گردد دراز
رزقہا را رزقہا او می دہد
زانکہ گندم بی غذای کی زید
نیست شرح این سخن را منتہی
پارۂ گفتم بدان زان پارہ ہا

اب قاضی سجاد حسین کا ترجمہ دیکھیں:

''میں نے ذرے دیکھے جن کے منھ کھلے ہوئے تھے، اگر میں ان کی خوراک کا بیان کروں تو بات بڑھ جائے گی۔ پتوں کو ساز و سامان اس (اللہ) کے انعام سے ہے، پرورش کرنے والوں کو دایہ اس کی عام مہربانی ہے۔ وہ (اللہ) رزقوں کو رزق دیتا ہے، کیونکہ گیہوں بغیر غذا کے کب پرورش پاتا ہے۔ اس بات کی تفصیل کا خاتمہ نہیں ہے، میں نے ایک ٹکڑا کہہ دیا، تو اس سے (اور) ٹکڑوں کو سمجھ لے۔ تمام عالم کو کھانے والا اور کھایا ہوا سمجھ، باقی رہنے والوں کو مقبول اور با اقبال سمجھ۔''[۱۸]

پریشانیاں شامت اعمال کا نتیجہ ہیں

''مثنوی معنوی'' کے دفتر سوم میں 'قصۂ اصحاب ضروان و حیله کردن ایشان تا بی زحمت فقیران باغها را قطاف کنند' کے عنوان کے ذیل میں مولانا رومی مخلوق کے اعمال اور شامت اعمال اور جزا و سزا اور نامہ اعمال دینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ دنیا سفرگاہ ہے، انسان مسافر کی طرح ہے، دوران سفر اس نے راستہ میں کیا کیا مناسب یا نامناسب عمل کیے اور کن کن راستوں کو اختیار کیا اور نتیجتاً اسے کہاں پہنچنا ہے۔ یہ ساری باتیں خالق کو پہلے سے معلوم ہیں۔ مولانا رومی اسی ضمن میں قوم ضروان کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

'قوم ضروان' یمن میں مقام 'صنعا' کے قریب آباد تھی، جن کا واقعہ قرآن پاک کے 'سورہ نون' میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ ان کا ایک ہرا بھرا باغ تھا جو کافی پھل دیا کرتا تھا، جس سے وہ غریبوں کی بھی خوب امداد کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ان میں بدنیتی پیدا ہوگئی، لہذا انھوں نے محتاجوں کا حصہ بھی ہڑپ کر ہضم کر لینے کی تدبیر سوچی اور اس ارادے سے وہ صبح سویرے ہی سارے پھل توڑ لینے کے لیے نکل پڑے، لیکن جب باغ میں پہنچے تو جسے وہ ہرا بھرا اور پھلوں سے لدا ہوا چھوڑ کر گئے تھے، بالکل ویران اور پھلوں سے خالی ہو چکا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اس پر کبھی کوئی پھل آیا ہی نہ ہو۔ ان کے درختوں پر خدائی عتاب نازل ہو چکا تھا۔ اب ''مثنوی معنوی'' کے اشعار

اوراس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

قصۂ اصحاب ضروان خواندۂ
پس چرا در حیلہ جوئی ماندۂ
حیلہ می کردند کژدم نیش چند
کہ برند از روزی درویش چند
شب ہمہ شب می سگالیدند مکر
روی در رو کردہ چندین عمر و بکر
خفیہ می گفتند سرہا آن بدان
تا نباید کہ خدا دریابد آن
با گل اندایندہ اسگالید گل
دست کاری می کند پنہان ز دل
کیف لا یعلم هواک من خلق
ان فی نجواک صدقا ام ملق
کیف یغفل عن ظعین قد غدا
من یعاین ابن مثواه غدا
اینما قد هبط اور صعدا
قد تولاه و احصی عددا

''تو نے ضروان والوں کا قصہ پڑھا ہے، پھر تو کیوں حیلہ جوئی میں لگا ہے؟ چند بچھو جیسے ڈنک والے تدبیر کرتے تھے، کہ چند فقیروں کی روزی مارلیں۔ تمام رات مکر اور حیلے سوچتے رہے، آمنے سامنے ہوکر بہت سے عمرو بکر۔ ان نالائقوں نے رازمخفی طور پر کہے، تاکہ خدا ان کو نہ جان لے۔ کہگل نے کہگل کرنے والے کے خلاف سوچا؟ ہاتھ، دل سے چھپا کر کوئی کام کرتا ہے؟ تیری خواہش کو کیسے نہ جانے گا جس نے پیدا کیا،

تیری خفیہ باتوں میں سچائی ہے یا جھوٹ۔خوش عیش ہودج نشین سے وہ کیسے ناواقف ہوگا؟ جو دیکھ رہا ہے کہ گل کو اس کا ٹھکانا کہاں ہے؟ کہاں وہ نشیب میں اتری، کہاں اونچائی پر چڑھی؟ وہ اس کا نگراں ہے اور اس نے شمار کرلیا ہے۔''[۱۹]

حاصل کلام یہ کہ خالق کائنات دنیا کے مسافروں کی چال ڈھال اور طرز روش سے پورے طور پر واقف ہے اور ان کے رفتار، گفتار اور کردار کے مطابق ہی اپنے فیصلے تیار کرتا ہے۔

ظلم کو خدا کبھی معاف نہیں کرتا

مولانا کہتے ہیں کہ ہر ایک کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو کسی کے ساتھ ظلم مت کرو، ظلم تو ظلم ہی ہے جسے خدا کبھی برداشت نہیں کرتا اور اگر یہ ظلم اپنے اعزا و اقربا پر کیا جائے تو اس کی سنگینی مزید بڑھ جاتی ہے۔اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انسان کو اپنے اقربا سے کبھی برائی کی امید نہیں ہوتی۔

یک جفا از خویش و از یار و تبار
در گرانی ہست چون سیصد ہزار
زانکہ دل ننہاد بر جور و جفاش
جانش خوگر بود با مہر و وفاش
ہرچہ بر مردم بلا و شدت ست
این یقین دان کز خلاف عادت ست

''اپنے عزیز، اپنے دوست اور خاندان کا ایک ظلم، شدت میں تین لاکھ سے زیادہ ہے۔کیونکہ دل اس کے ظلم و زیادتی کا عادی نہ تھا، جان اس کی محبت اور وفاداری کی عادی تھی۔انسانوں پر جو مصیبت اور سختی ہے، یقین کر، خلاف عادت ہونے کی وجہ سے ہے۔''[۲۰]

مولانا رومی کے مطابق ظلم اور ناانصافی کا رویہ روا رکھنا خاص کر اپنے اعزا و اقربا کے ساتھ، گناہوں کی شدت میں تین لاکھ گنا اضافہ کر دیتا ہے۔ (جاری)

حوالہ جات

۱۔ حیات سعدی ـــ خواجہ الطاف حسین حالی، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ (دہلی) ۲۰۱۱ء، ص:۱۴۳

۲۔ ایضاً، ص:۷۵

3- Wisdom of the East Sadi's Scroll of Wisdom, Arthur N. Wollaston, Introduction, P-25, John Murry, Albemarle Street, London, 1906.

۳۔ الف۔ معارف (اعظم گڑھ) فروری ۱۹۹۱ء، صفحات-۱۵۱تا۱۵۳

۴۔ ترجمہ مثنوی معنوی ـــ قاضی سجاد حسین، مقدمہ دفتر اول

۵۔ ایضاً، مقدمہ دفتر دوم

۶۔ ایضاً، مقدمہ دفتر سوم

۷۔ ایضاً، مقدمہ دفتر چہارم

۸۔ ایضاً، مقدمہ دفتر پنجم

۹۔ ایضاً، مقدمہ دفتر ششم

۱۰۔ ایضاً، دفتر اول، صفحات:۵۶تا۵۸

۱۰۔ الف۔ ایضاً، دفتر اول، ص:۷۲

۱۱۔ ایضاً، دفتر اول، ص:۱۱۹

۱۲۔ ایضاً، دفتر اول، ص:۱۲۴

۱۳۔ ایضاً، دفتر دوم، ص:۳۰

۱۴۔ ایضاً، دفتر دوم، ص:۳۰

۱۵۔ ایضاً، دفتر دوم، ص:۵۵

۱۶۔ ایضاً، دفتر دوم، صفحات:۲۸۵تا۲۸۷

۱۷۔ ایضاً، دفتر دوم، ص:۲۹۳

۱۸۔ ایضاً، دفتر سوم، ص:۱۷

۱۹۔ ایضاً، دفتر سوم، صفحات:۵۶تا۵۷

۲۰۔ ایضاً، دفتر سوم، ص:۶۹

محمد بدرعالم ندوی *

تحریکِ ریشمی رومال میں
شاہ عبدالرحیم رائے پوری کا کردار

مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری کی ولادت ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں موضع تِگری میں ہوئی۔[۱] تگری اُس وقت تحصیل تھانیسر ضلع کرنال (پنجاب) کا حصّہ تھا اور موجودہ جغرافیہ میں تحصیل جگادھری، ضلع یمنا نگر (ہریانہ) میں واقع ہے۔ ۱۹۲۱ھ/۱۸۷۴ء میں مظاہر علوم سہارنپور سے درسِ نظامی کی تکمیل کی۔[۲] اُن کے اساتذہ میں مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی (۱۸۹۶-۱۸۱۲ء)، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری (۱۸۸۰-۱۸۱۰ء) اور مولانا محمد مظہر نانوتوی (۱۸۸۵-۱۸۲۱ء) جیسی یگانۂ روزگار شخصیات شامل ہیں۔[۳] شیخ میاں عبدالرحیم سرساوی ثم سہارنپوری (م ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۵ء) اور مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۹۰۵-۱۸۲۶ء) سے تصوف وسلوک میں کسبِ فیض کیا اور دونوں مشائخ سے مختلف سلسلوں میں خرقۂ خلافت حاصل ہوا۔[۴] مولانا گنگوہی سے قبل حاجی امداداللہ مہاجر مکّی (۱۸۹۹-۱۸۱۸ء) سے بھی بیعت و ارادت کا تعلق رہا اور اُن سے بھی مجازِ بیعت ہوئے۔[۵] اپنے پہلے شیخ میاں عبدالرحیم سہارنپوری کی ہدایت پر ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۲ء میں رائے پور میں مستقل سکونت اختیار کی۔ رائے پور

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

میں انھوں نے مسجد، مدرسہ اور خانقاہ قائم کر کے ایک علمی اور تعلیمی و تربیتی مرکز قائم کیا۔ رائے پور کے اِس مرکز کو خانقاہِ رحیمی رائے پور کے نام سے بڑی شہرت حاصل ہوئی۔[۶] ان کی وفات ۲۵ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ-۲۸ جنوری ۱۹۱۹ء میں ہوئی اور رائے پور میں سپردِ خاک ہوئے۔[۷] ان کے جانشین ان کے شاگردِ رشید مولانا عبدالقادر رائے پوری (۱۸۷۴-۱۹۶۲ء) ہوئے جو اپنے عہد کے مشہور شیخِ طریقت اور مصلح و مربی تھے۔

جدوجہد

مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری نے مختلف میدانوں میں خدمات انجام دی ہیں۔ انفرادی تزکیہ و تربیت، حصولِ آزادی، دینی تعلیم کی اشاعت، اصلاحِ عقائد و اعمال اور رسوم و بدعات کا ازالہ ان کی جدوجہد کے نمایاں میدان رہے ہیں۔

اپنے عہد میں قومی سیاست اور تحریکِ آزادی میں بھی انھوں نے بھرپور حصّہ لیا۔ جدوجہدِ آزادی میں اُن کا کردار 'تحریکِ ریشمی رومال' کے حوالے سے زیادہ نمایاں ہے۔ اِس تحریک کے ایک اہم راز دان، قائد و سرپرست اور ناظمِ اعلیٰ کی حیثیت سے انھوں نے جس طرح سرپرستانہ جدوجہد کی، اسی طرح ضروری تقاضوں کے پیشِ نظر عملی جدوجہد میں بھی حصّہ لیا۔

سرپرستانہ کردار

مولانا رشید احمد گنگوہی جن کے بڑے خلفاء میں مولانا رائے پوری بھی تھے، کی وفات کے بعد مولانا رائے پوری کو جماعت کے بزرگ سرپرست کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا۔ اپنے رفقاء اور معاصرین کے درمیان اُن کی رائے ایک وزن رکھتی تھی اور ہر اہم معاملے میں اُن سے مشاورت کی جاتی تھی۔ اپنے شیخ کی وفات کے بعد وہ اپنے مشائخ و اسلاف سے متعلق اداروں اور جماعتوں اور تحریکوں کے حوالے سے سرپرستانہ اور مربّیانہ کردار ادا کر رہے تھے۔ چناں چہ انھوں نے تحریک ریشمی رومال کے حوالے سے بھی سرپرستانہ کردار ادا کیا۔

بہت سے مکاتب و مدارس اور اداروں و تحریکوں کی طرح اُن کے وقیع اور دوررس مشورے

تحریکِ ریشمی رومال کے قائدین میں بھی قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔تحریک کے قائدِ اعلیٰ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (۱۹۲۰-۱۸۵۱ء) جس طرح ان کا بڑا احترام اور ان پر آخری درجہ کا اعتماد کرتے تھے، اسی طرح ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے تھے۔[۸] چناں چہ تحریک کی اعلیٰ قیادت بشمول شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری (۱۹۲۷-۱۸۵۲ء) وغیرہ رائے پور میں جمع ہوتے تھے جو اس وقت کے سیاسی ہنگامے میں اپنے آبادیاتی اور جغرافیائی حالات کے لحاظ سے بھی موزوں تھا اور مولانا رائے پوری کی خانقاہ میں باہمی مشاورت، فیصلہ سازی اور منصوبہ بندی کیا کرتے تھے۔[۹] الغرض تحریک کے اہم امور میں جو مشاورت ہوتی، جو اہم فیصلے کیے جاتے اور جو حضرات منصوبہ بندی اور فیصلہ سازی کرتے، ان میں ایک اہم نام مولانا رائپوری کا ہے۔

مولانا رائے پوری کی وفات پر شیخ الہند نے جو کہ اس وقت مالٹا میں اسیر تھے، انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے جو طویل مرثیہ لکھا اور جو مسدسِ مالٹا کے نام سے شائع ہوا، اس میں بھی ان کی رائے اور مشورے کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے یہ اشعار تحریر کیے ہیں:

ہمدمو! رائے کس سے لوگے، کہو
مشورے کس سے اب کروگے، کہو
رازِ دل کس سے اب کہوگے، کہو
رائے پور بھی کبھی چلوگے، کہو
زینت و زیبِ الف ثانی مرد
شاہ عبدالرحیم ثانی مرد [۱۰]

افرادی قوت کی فراہمی اور مالی امداد کی ترسیل

سرپرستانہ جدوجہد کے ساتھ مولانا رائے پوری نے تحریک ریشمی رومال میں عملی جدوجہد بھی کی۔تحریک کو افرادی طاقت اور مالی امداد کی فراہمی میں انھوں نے بھرپور حصہ لیا۔صوبہ جات متحدہ اور پنجاب اور ریاستِ بہاول پور کے وسیع خطّے اور اِن کے نواحی علاقوں میں ان کا وسیع حلقۂ اثر تھا اور بڑی تعداد میں لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے۔اپنے حلقۂ اثر میں ایک جانب انھوں نے تحریک

کے قائدِ اعلیٰ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کا اعتماد قائم کیا۔ تاکہ طے شدہ منصوبہ کے مطابق جیسے ہی ان کی جانب سے اعلانِ جنگ ہو، لوگ بغاوت وانقلاب اور حریت وآزادی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ دوسری جانب معتمد احباب ورفقاء کے ذریعہ چندہ اکٹھا کر کے خفیہ طریقے سے تحریک کے متعلقہ کارکنان تک پہنچایا۔[۱۱] تاکہ وہ خفیہ مقاصد وعزائم بروئے کار لائے جائیں جن کا تحریک کے ایک راز دار کی حیثیت سے انھیں علم رہتا تھا۔

پنجاب کی سی آئی ڈی پولیس نے تحریک کے کارکنان کا جو ریکارڈ تیار کیا تھا اور بعد میں جس کا اردو ترجمہ 'ریشمی خطوط کے کیس میں کون کیا ہے' کے عنوان سے ہوا، اس میں بھی تحریک کے لیے مولانا رائے پوری کے اِس جہد وکردار کا ذکر ملتا ہے کہ وہ شیخ الہند کی جہاد کی اسکیموں میں شریک تھے، دیوبند کے مدرسہ کی کمیٹی میں بھی شامل تھے اور شیخ الہند کی عدمِ موجودگی میں ان کے نائب نمائندہ کے طور پر روپیہ جمع کرنا اور اسے تحریک کے ناظمِ مالیات مولوی حمد اللہ پانی پتی کو پہنچانا ان کی ذمہ داری تھی۔[۱۲] الغرض لوگوں کے وسیع حلقہ میں شیخ الہند کا اعتماد قائم کرنا اور تحریک کو افراد اور امداد فراہم کرنا، یہ وہ عملی کردار ہے جو مولانا رائپوری نے تحریک کے لیے انجام دیا۔

انگریز فوج کی خفیہ معلومات سے واقفیت کا طریقہ

تحریک میں مولانا رائے پوری کا عملی کردار اِس لحاظ سے قدرے منفرد تھا کہ انھوں نے خفیہ طور پر کسی نہ کسی شکل میں انگریزوں کے فوجی مراکز اور راستوں، اور ان کی نقل وحرکت اور خفیہ منصوبوں سے واقفیت کی راہ نکال رکھی تھی۔ تاکہ ان کی فوجی معلومات اور ان کی نقل وحرکت بھی معلوم ہوتی رہے اور انقلاب اور جنگ کے اعلان کے موقع پر ان کے ٹھکانوں کو نشانہ بھی بنایا جائے۔

اس کی شکل اس طرح پیدا ہوئی کہ ان کے ایک معتمد مرید مستری احمد حسن مسوری دہرادون (اتراکھنڈ) میں واقع انگریزوں کے فوجی سروے آفس میں ملازم تھے جہاں انگریز حکومت کے اہم مقامات کے نقشے تیار ہوتے تھے۔ مستری احمد حسن نے انگریز افسروں پر اس حد تک اپنا اعتماد قائم کر رکھا تھا کہ وہ اتوار کو چھٹی کے روز دفتر کی چابیاں ان کے سپرد کر جاتے تھے۔ مستری احمد حسن خفیہ طور پر نقشے لے کر خانقاہ رائے پور پہنچ جاتے اور وہ نقشے اور دستاویزات مولانا کو دکھاتے اور پھر نقشوں کو واپس آفس

میں رکھ دیتے۔ مولانا رات کی تنہائی میں اُن نقشوں کو ملاحظہ کرتے اور حسّاس ٹھکانوں کی معلومات حاصل کرتے تھے۔[۱۳]

مولانا تحریک کے مراکز اور ان کے راستوں سے واقفیت کو بھی بڑی اہمیت دیتے تھے۔ تاکہ مالی امداد کی فراہمی جسے وہ از خود انجام دیتے تھے اور ہدایت و پیغام کی ترسیل آسان ہو۔[۱۴] یہ وہ کوششیں تھیں جو تحریک کے اصل ہدف کو بروئے کار لانے سے قبل انجام دی جارہی تھیں۔

انگریز اقتدار کے خلاف بیعت

تحریک ریشمی رومال، جس کا مقصد و ہدف انگریز اقتدار کے خلاف انقلاب لانا تھا اور جو اِس مقصد کے لیے خفیہ طور پر کام رہی تھی، اس کے طریقۂ کار کا ایک پہلو یہ تھا کہ اُس کے چنندہ قائدین و رہبران انگریز اقتدار کے خاتمے کے لیے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں معتمد افراد و کارکنان سے خفیہ طور پر بیعتِ جہاد لیتے تھے۔ تاکہ جیسے ہی آزادی کی جنگ اور انقلاب کا اعلان ہو، بیعت کے ذریعہ عہدِ جہاد کرنے والے افراد انگریز اقتدار سے آزادی حاصل کرنے کے لیے اس میں حصّہ لیں۔ ان بیعتِ جہاد لینے والوں میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے ساتھ مولانا رائے پوری کا اسمِ گرامی بھی معلوم ہوا ہے۔ مولانا رائے پوری نے اپنے تلمیذِ رشید، خادمِ خاص اور خلیفہ و جانشین مولانا عبدالقادر رائے پوری کو اپنے مرضِ وفات میں ہدایت کی تھی کہ وہ ان کی جانب سے بھی اور اپنی جانب سے بھی مولانا خلیل احمد سہارنپوری سے بیعتِ جہاد کریں۔ اِس واقعہ کو خود مولانا عبدالقادر نے بیان کیا ہے جو ان کے ملفوظات میں موجود ہے۔[۱۵]

چوں کہ یہ مولانا رائے پوری کا آخری زمانۂ حیات تھا، لہٰذا ان کی یہ ہدایت اِس معنی میں تھی کہ تحریک ریشمی رومال کے پلیٹ فارم سے حریت و آزادی کی جو جدوجہد ہو رہی ہے، وہ ان کے بعد بھی جاری رہے اور ان کے متعلقین اگلے دور میں بھی اسے جاری رکھیں۔ اپنی زندگی کے اس اخیر حصّہ میں عین ممکن ہے کہ یہ ہدایت و وصیت انھوں نے رازداری کے ساتھ اپنے دیگر قریب ترین متعلقین کو بھی اس غرض سے کی ہو کہ اگر ان کا مقصد و مشن ان کی زندگی میں ادھورا رہ جائے تو اگلی نسل اسے پایۂ تکمیل کو پہنچائے۔

نائب سالار

تحریک ریشمی رومال کی تاریخ وسرگزشت سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کو منظّم ومربوط کرنے اور مختلف علاقوں میں مختلف ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے مختلف عہدے ومناصب وجود میں لائے گئے تھے اور بہت سے عہدے داران ومنصب داران کا تعین کیا گیا تھا۔ چوں کہ ابھی تک یہ تحریک خفیہ تھی، لہٰذا یہ تعین بھی خفیہ طریقے سے کیا گیا تھا جس کا علم تحریک کے راز داران تک محدود تھا۔

تحریک میں مولانا رائے پوری کا کیا کردار تھا اور ان کی شخصیت کس عظمت واہمیت کی حامل تھی اور تحریک کے قائدین وارکان میں اُن کا کیا مقام ومرتبہ تھا، اس کا اندازہ اِس بات سے بھی بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی نے جب تحریک کے 'منصب دارانِ جنودِ ربانیہ' کی فہرست مرتب کی تو اس کے نائب سالاروں میں دوسرا نام مولانا رائے پوری کا تھا۔ [۱۶]

شیخ الہند کے قائم مقام اور تحریک کے ناظمِ اعلیٰ وسرپرست

تحریک کے متعین کردہ ہدف کہ 'انگریز اقتدار کے خلاف ایک ہمہ گیر انقلاب شروع کیا جائے۔' کی تیاریوں کے آخری مرحلے میں طے شدہ منصوبے کے مطابق جب شیخ الہند کے لیے حجاز کے قیام کا فیصلہ ہوا اور ۱۹۱۵ء میں وہ حجاز روانہ ہونے لگے تو انھوں نے مولانا رائے پوری کو اپنا قائم مقام مقرر کیا اور تمام کارکنان کو تاکید کی کہ اہم امور ومعاملات مولانا سے مشاورت کے بعد انجام دیے جائیں۔ [۱۷]

وہ اجلاس جس میں شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی قیامِ حجاز کی تجویز منظور ہوئی تھی اور مولانا رائے پوری کو تحریک کی قیادت سونپی گئی تھی، مظاہر علوم سہارنپور میں منعقد ہوا تھا۔ اس کی کچھ تفصیلات شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے اپنی تالیف ''آپ بیتی'' میں بھی تحریر کی ہیں اور مولانا عبدالرشید ارشد، مدیر ماہ نامہ الرشید، ساہیوال کے نام اپنے ایک مکتوب میں بھی ذکر کی ہیں۔ [۱۸]

تحریک کی قیادت وسیادت

شیخ الہند طے شدہ منصوبے کے مطابق حجاز میں قیام پذیر تھے اور وہاں سے تحریک کی قیادت کر رہے تھے کہ ان کے نام لکھا گیا مولانا عبید اللہ سندھی کا ایک خط انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا۔ اس طرح انگریزوں کو اِس تحریک کی بھنک لگ گئی۔ چناں چہ شیخ الہند کو حجاز سے گرفتار کر لیا گیا اور مالٹا میں نظر بند کر دیا گیا۔ بہت سے مقامات پر چھاپے مارے گئے اور بہت سے سرگرم کارکنان کو گرفتار کر لیا گیا۔[19]

گزشتہ سطور میں ذکر ہوا ہے کہ شیخ الہند نے ۱۹۱۵ء میں حجاز روانگی کے وقت مولانا رائے پوری کو اپنا قائم مقام متعین کر دیا تھا۔ اس وقت سے لے کر ۱۹۱۹ء میں اپنی وفات تک جب کہ ابھی شیخ الہند مالٹا ہی میں قید تھے، مولانا نے پورے طور پر تحریک کی قیادت وسرپرستی کی اور پورے عزم واستقلال اور رازداری سے تحریک کے اعلیٰ سطح کے کام انجام دیے۔[20]

۱۹۱۵ء کے بعد کا زمانہ جب تحریک کا راز فاش ہوا اور شیخ الہند کی گرفتاری ہوئی، تحریک کی تاریخ کا بڑا نازک وقت تھا۔ تحریک کا راز فاش ہونے کے بعد اس کے قائدین وکارکنان کی گرفتاریاں ہوئی تھیں، کئی مقامات پر چھاپے مارے گئے تھے، بہت سے کارکنان سے تفتیش کی گئی تھی، بہت سے افراد شک کے دائرے میں تھے اور بہت سے منتشر اور گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ اس طرح تحریک کا شیرازہ منتشر ہو گیا تھا۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۹ء تک جس وقت مولانا رائے پوری کی وفات ہوئی، انھوں نے تحریک کی شیرازہ بندی اور شیخ الہند کے مشن کو جاری رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ اِس زمانے میں 'رائے پور' تحریک کے اہم خفیہ مراکز میں سے ایک تھا جہاں مولانا خود کمان سنبھالے ہوئے تھے اور کارکنان کی شیرازہ بندی قائم ودائم رکھنے کی مسلسل کوشش کر رہے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام تک انھوں نے شیخ الہند کے قائم مقام اور تحریک کے ناظمِ اعلیٰ کی حیثیت سے تحریک کے اہم امور ومعاملات اور اعلیٰ سطح کی کارروائیوں کو نہایت رازدارانہ طریقہ سے انجام دیا۔ جب کہ فروعی امور اور سطحی کارروائیوں کو مولانا احمد اللہ پانی پتی انجام دیتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریک کے انتشار وافتراق کے زمانے میں یہ دونوں حضرات کسی نہ کسی طور پر تحریک کو زندہ رکھے ہوئے تھے اور اسے بچانے کی ہر ممکن تدبیر وکوشش

کر رہے تھے۔ اِن دونوں کے اِس کردار کو مولانا حسین احمد مدنی نے خودنوشت سوانح 'نقشِ حیات' میں سراہا ہے۔[۲۱]

انگریز سی آئی ڈی کی تفتیش

انگریزوں کو جب اِس تحریک کی بھنک لگ گئی اور انھیں اِس کی وسعت و طاقت سے خوف پیدا ہوا اور بڑے پیمانے پر تحقیقات شروع ہوئی اور تحریک کے مراکز پر چھاپے مارے گئے اور سرکردہ افراد اور سرگرم کارکنان کی گرفتاریاں عمل میں آئیں تو انگریزوں کی سی آئی ڈی خانقاہ رائے پور بھی پہنچی اور مولانا رائے پوری سے تفتیش کی۔ حالاں کہ ان دنوں مولانا صاحبِ فراش تھے، مگر پورے عزم و استقلال اور بے باکی و بے نیازی کے ساتھ انھوں نے انگریز سی آئی ڈی افسران کو جوابات دیے۔

مولانا عبدالقادر رائے پوری کے شاگردِ رشید شاہ انور حسین نفیس الحسینی نے اپنی کتاب 'شعرالفراق' میں ان سوالات و جوابات کو قلم بند کیا ہے۔[۲۲] نیز مولانا حسین احمد مدنی نے بھی اِس واقعہ کا مختصر تذکرہ اپنی خودنوشت سوانح 'نقشِ حیات' میں کیا ہے۔[۲۳]

جرأت مندانہ کردار

(الف) جرأت مندی اور حوصلہ افزائی:

شیخ الہند کی مالٹا اسیری اور تحریک کی نمائندہ قیادت کی گرفتاری کے بعد کا زمانہ تحریک کے انتشار کا زمانہ تھا جب انگریزوں کی قید و بند کے خوف سے بہت سے کارکنان خاموش، گوشہ نشین اور منتشر ہو گئے تھے۔ اِس ماحول میں نہ صرف تحریک سے وابستہ افراد، بلکہ عام واقفین و متعلقین بھی عمومی سطح پر تحریک اور اُس کے علماء و قائدین سے لاتعلقی کا اظہار کر رہے تھے۔ اِس نازک موقع پر مولانا رائے پوری نے پورے عزم و ثبات کے ساتھ لوگوں کی ہمت سازی اور حوصلہ افزائی کی اور ان کے دلوں سے انگریزوں کا خوف اور حالات سے مایوسی دور کرنے کا فریضہ ادا کرتے رہے۔

شیخ الہند کو جب انگریزوں نے 'مالٹا' میں نظر بند کر دیا تھا اور ان سے وابستہ افراد، اداروں اور

جماعتوں پر سخت نظر رکھی جا رہی تھی تو اِن حالات میں بہت سے لوگ ان کا نام زبان پر لانے سے بھی ڈرنے لگے تھے۔ دیوبند میں شیخ الہند کا جو مکان تھا، نہ صرف عام لوگوں نے، بلکہ ان کے اعزاء واقرباء اور احباب و متعلقین نے بھی وہاں جانا بالکل ترک کر دیا تھا۔ شیخ الہند کی اہلیہ اور صاحب زادیاں مکان پر اِس طرح تنہا ہوگئی کہ انھیں اشیائے خورد ونوش خریدنے میں بھی مشکل پیش آنے لگی۔ حالاں کہ یہ ایک پُرخطر اور نازک وقت تھا اور شیخ الہند کے تعلق سے کسی بھی قسم کی وابستگی کا اظہار انگریزوں کی تحقیق و تفتیش کو دعوت دینا تھا، تاہم مولانا رائے پوری نے اِس کی پرواہ کیے بغیر شیخ الہند کے مکان پر کئی روز قیام کیا اور دارالعلوم دیوبند جس کے وہ ایک سرپرست رکن تھے، کی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس بھی وہیں منعقد کیا۔ نیز وہاں کے دورانِ قیام بلاخوف وخطر حاضرین کو نہ صرف شیخ الہند کے فضائل وکمالات، بلکہ جہاد کے فضائل بھی بدستور پوری شدت ووضاحت کے ساتھ ذکر کرتے رہے۔ شاہ انور حسین نفیس الحسینی نے اپنے مضمون 'تحریکِ ریشمی رومال کے سرپرستِ اعلیٰ؛ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری' میں مولانا رائے پوری کے مسترشدِ خاص اور مجازِ بیعت مستری احمد حسن کے حوالے سے اِس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے۔[۲۴]

(ب) دورانِ اسیری شیخ الهند سے خط و کتابت:

مالٹا اسیری کے دوران بھی شیخ الہند اور مولانا رائے پوری کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ حالاں کہ خطوط کئی کئی مہینوں کے بعد مالٹا پہنچتے تھے، کیوں کہ تحقیق وتفتیش کے مقصد سے انھیں اسکین کرنے اور ان کی جانچ کرنے کے لیے پہلے انھیں لندن لے جایا جاتا تھا اور پھر وہاں سے مالٹا پہنچایا جاتا تھا۔ مولانا کے نام شیخ الہند کا ایک اہم خط کتاب 'شیخ الہند مولانا محمود حسن، ایک سیاسی مطالعہ' مؤلفہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری میں موجود ہے۔ یہ مولانا کے ارسال کردہ خط کا جواب ہے۔ غالباً مولانا نے اپنے خط میں شیخ الہند سے رہائی کے بعد ہندستان تشریف لانے اور یہیں قیام کرنے کی درخواست کی تھی۔ اِس خط میں شیخ الہند نے مولانا کی اِس درخواست کا جواب بھی تحریر کیا ہے اور مولانا کی شدید خواہش پر قرآن کا جو ترجمہ وہ تحریر کر رہے تھے، اس کے تعلق سے بھی یہ معلومات تحریر کی ہیں کہ یہ کام بدستور جاری ہے اور سورۂ احزاب تک مکمل ہوگیا ہے۔ نیز مالٹا میں اپنی مصروفیات اور اپنے رفقاء کے حالات بھی مختصراً تحریر کیے ہیں۔[۲۵]

حواشی وحوالہ جات

۱۔ تذکرہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری—مفتی مسعود عزیزی ندوی، رائے پور،ضلع سہارنپور(یوپی) شعبۂ نشر و اشاعت مدرسہ فیضِ ہدایت درگلزارِ رحیمی خانقاہ رائے پور(۱۴۳۳ھ/۲۰۱۲ء) ص:۴۳

۲۔ سوانح حیات مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری—مفتی عبدالخالق آزاد،مطبوعات رحیمیہ، دہلی(۲۰۲۱ء)[طبعِ سوم] ص:۹۴

۳۔ احوال العارفین—حافظ غلام فرید،نذیرسنز پبلشرز،لاہور(۱۹۷۹ء)[طبعِ اوّل]ص:۱۳۷،سوانح حیات مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری،ص:۹۴تا۹۶

۴۔ سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری—مولانا ابوالحسن علی ندوی، مکتبہ اسلام،لکھنؤ(۲۰۱۲ء) ساتواں ایڈیشن،ص:۳۲۱،حاشیہ—سیدنفیس الحسینی،شعرالفراق،سیداحمدشہیداکادیمی(لاہور)۱۹۷۸ء،ص:۷۸

۵۔ حضرت حاجی امداداللہ مہاجرمکی اوران کے خلفاء— ڈاکٹر قاری حافظ فیوض الرحمٰن،مجلس نشریاتِ اسلام،کراچی (۱۹۸۴ء)ص:۱۸۹تا۱۹۳

۶۔ شعرالفراق—سیدنفیس الحسینی،سیداحمدشہیداکادیمی،لاہور(۱۹۷۸ء)ص:۷۶۔۷۷

۷۔ تذکرۂ الخلیل—مولاناعاشق الٰہی میرٹھی،مکتبہ خلیلیہ،سہارن پور(۱۹۹۱ء)[طبعِ دوم]ص:۲۶۵۔۲۶۶

۸۔ شعرالفراق،سیدنفیس الحسینی،سیداحمدشہیداکادیمی،لاہور(۱۹۷۸ء)ص:۸۲، رائے پوری، ارشادات قطب الارشادحضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادررائے پوری—حبیب الرحمٰن، کتب خانہ اختری،سہارنپور،(۱۹۹۹ء) ص:۱۲

۹۔ سوانح حیات مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری عبدالخالق آزاد،مطبوعات رحیمیہ،دہلی(۲۰۲۱ء)[طبعِ سوم] ص:۲۴۹

۱۰۔ مسدس مالثا-شیخ الہند مولانا محمودحسن دیوبندی،ماہنامہ القاسم(دیوبند) بابت رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ، بعنوان ''ترجیع بند درمرثیۂ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری قدس سرہٗ''،مرتب:محمداعزازعلی،ص:۸ حاشیہ:اس مرثیہ سے قبل اعزازعلی کی مندرجہ بالاتحریر درج ہے:''یہ مسدس قطب العالم حضرت مولانا الحاج المولوی محمودحسن صاحب **متعنا الله بطول حياته** نے مالٹامیں اپنی نظربندی کے زمانہ میں حضرت شیخ المشائخ مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب قدس اللہ سرہ کی وفات سے متاثر ہوکرتحریرفرمایا تھا۔ ہندوستان میں تشریف آوری

کے بعد ہم کو ایک دوست کے ذریعہ سے مل گیا، اس لیے ذی علم حضرات کی خدمت میں بطور نادر تحفہ کے پیش کیا جاتا ہے۔

۱۱۔ تحریکِ شیخ الہند (ریشمی خطوط سازش کیس) مولانا سید محمد میاں دیوبندی، الجمعیۃ بک ڈپو، دہلی (۱۹۷۵ء) ص:۳۶۴

۱۲۔ ایضاً، ص:۳۶۴

۱۳۔ شعرالفراق—سید نفسی الحسینی، سید احمد شہید اکادیمی، لاہور، (۱۹۷۸ء) ص:۸۵، ۸۶

۱۴۔ سوانح حیات مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری—عبدالخالق آزاد، مطبوعات رحیمیہ دہلی، (۲۰۲۱ء) [طبعِ سوم] ص:۲۵۵

۱۵۔ ارشادات مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری—حبیب الرحمٰن رائے پوری، کتب خانہ اختری، سہارنپور (۱۹۹۹ء)، مجلس ۶ رمضان المبارک ۱۳۶۷ھ/۱۴ جولائی ۱۹۴۸ء، بروز بدھ، بمقام رائے پور، ص:۲۲۴-۲۲۵

۱۶۔ تحریکِ شیخ الہند (ریشمی خطوط سازش کیس) مولانا سید محمد میاں دیوبندی، الجمعیۃ بک ڈپو، دہلی، ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء، ص:۲۷۴

۱۷۔ نقشِ حیات-مولانا حسین احمد مدنی، مکتبہ شیخ الاسلام، دیوبند (۲۰۰۷ء) ج:۲، ص:۲۵۴

۱۸۔ آپ بیتی—شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، مکتبہ یادگارِ شیخ، سہارنپور (۲۰۱۴ء) ج:۱، ص:۳۳۲ تا ۳۳۴، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے اِس واقعہ کو الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ مولانا عبدالرشید ارشد، مدیر ماہنامہ الرشید کے نام اپنے ایک مکتوب میں بھی بیان کیا ہے۔ ماہنامہ الرشید (دارالعلوم دیوبند نمبر) بابت ماہ صفر المظفر، ربیع الاول ۱۳۹۶ھ/ فروری، مارچ ۱۹۷۶ء، جلد:۴، شمارہ ۲-۳، مکتوب شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی بنام مولانا عبدالرشید ارشد، ص:۱۳۵-۱۳۶، طبع جامعہ رشیدیہ ساہیوال (پاکستان)

۱۹۔ شعرالفراق—سید نفیس الحسینی، سید احمد شہید اکادیمی، لاہور (۱۹۷۸ء) ص:۸۴

۲۰۔ نقشِ حیات، مولانا حسین احمد مدنی، مکتبہ شیخ الاسلام، دیوبند (۲۰۰۷ء) ص:۲۵۴ تا ۲۵۶

۲۱۔ نقشِ حیات مولانا حسین احمد مدنی، مکتبہ شیخ الاسلام، دیوبند (۲۰۰۷ء) ج:۲، ص:۲۴۳/ بعض دیگر مؤرخین کے مندرجہ ذیل بیانات بھی اس بات کی توثیق کرتے ہیں۔ چناں چہ مولانا اسیر ادروی، شاہ انور حسین نفیس الحسینی اور مفتی عبدالخالق آزاد نے اپنی اپنی کتابوں میں اِس واقعہ کو مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اسیر ادروی: حضرت مولانا شیخ الہند حیات اور کارنامے، شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند، (۲۰۱۲ء) ص:۱۸۸، سید نفیس الحسینی: شعر الفراق، سید احمد شہید اکادیمی، لاہور (۱۹۷۸ء) ص:۸۴، عبدالخالق آزاد: سوانح حیات مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری، مطبوعات رحیمیہ مطبوعات، دہلی (۲۰۲۱) [طبعِ سوم] ص:۲۵۴

۲۲۔ شعرالفراق — سیدنفیس الحسینی، سیداحمدشہیدا کادیمی، لاہور(۱۹۷۸ء)ص:۸۴

۲۳۔ نقشِ حیات — مولانا حسین احمد مدنی، مکتبہ شیخ الاسلام، دیوبند(۲۰۰۷ء)ص:۲۵۴ تا ۲۵۶

۲۴۔ سوانح حیات مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری — عبدالخالق آزاد، مطبوعات رحیمیہ، دہلی(۲۰۲۱ء)[طبعِ سوم]ص: ۲۶۶/ روایت مستری احمد حسن و بحوالہ تحریکِ ریشمی رومال کے سر پرستِ اعلیٰ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری (مضمون) سیدانور حسین نفیس، رقم: مطبوعہ ماہنامہ تذکرہ، لاہور

۲۵۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی(ایک سیاسی مطالعہ) — ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، مجلس یادگارِ شیخ الاسلام، کراچی(۱۹۸۸ء)ص:۱۲۵-۱۲۶

محمد تحسین زماں *
ندیم سحر عنبرین **

ہندوستانی مسلم خواتین اور خدمت خلق: ایک جائزہ

دردمندی، انسانیت، بھلائی، خیرخواہی اور دوسروں کے تئیں نرم جذبات یہ ایسے احساسات ہیں جو ہر قوم میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ تقریباً دنیا کے تمام ہی مذاہب میں ان جذبات کو سراہا جاتا ہے۔ مذہب اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو خصوصی طور پر اپنے ماننے والوں کو اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے حسن سلوک کریں اور اس کے برعکس کرنے والوں کے سلسلے میں واضح طور پر بتاتا ہے کہ جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اس پر اللہ بھی رحم نہیں کرتا۔[1]

کسی بھی انسان کے انتقال کر جانے کے بعد اس کے نیک و بد اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے سوائے ان صدقات کے جن کے فوائد جاری رہتے ہیں اور عوام الناس ان سے استفادہ کرتی رہتی ہے۔ مثلاً پھل دار درخت لگا کر دوسروں کے لیے سائے اور پھل کا انتظام کر جانا، کنواں کھدوانا یا پانی وغیرہ کا مستقل انتظام، دوسروں کی ہدایت کی غرض سے تحریری یا تحریکی سرمایہ وغیرہ وغیرہ۔

مذہب اسلام کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ اس نے جہاں اس دنیا کی آرائش و زیبائش میں مرد و زن کا باہمی کردار منضبط کیا، وہیں اپنے احکام و قوانین میں بھی دونوں کو یکساں مخاطب کیا، لہٰذا اسلام

* اسسٹنٹ پروفیسر، مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی، پٹنہ (بہار)
** گیسٹ فیکلٹی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

کے جو اصول وضوابط اور احکام وقوانین مردوں کے لیے ہیں، خواتین سے بھی اسلام عین انھیں اعمال و عقائد کا متقاضی ہے۔

خدمتِ خلق کے حوالہ سے اس میدان میں اگر خواتین کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے تو نتائج اطمینان بخش دکھائی دیتے ہیں۔ اس میدان میں کثیر تعداد میں خواتین سرگرم دکھائی دیتی ہیں۔ عہد عباسی میں زوجہ ہارون رشید ملکہ زبیدہ کا نہر کھدوانا، ساتویں صدی میں فاطمہ قرویٰ کا جامعہ القرویین قائم کرنا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ہندوستان میں بھی خواتین کثیر تعداد میں رفاہی کاموں میں سرگرم عمل دکھائی دیتی ہیں۔ بیگمات بھوپال اور ان کی رفاہی سرگرمیاں ایک علیحدہ تحقیق کا موضوع ہیں۔ زوجہ عبداللہ (پاپا میاں) بی اماں کی خدمات اس ضمن میں ناقابل فراموش ہیں۔ علمی ادارے قائم کرنے، خواتین کو میدان کارزار میں آگے بڑھنے اور ہندوستان کی پسماندہ قوم کو آگے بڑھانے میں مردوں کی طرح خواتین کا کردار بھی نمایاں رہا ہے۔ اس ضمن میں چند خواتین کی سماجی وفلاحی خدمات کا تعارف حسبِ ذیل ہے:

سکندر جہاں بیگم

نواب سکندر جہاں بیگم بھوپال کی فرماں روا تھیں۔ سکندر جہاں اعلیٰ درجہ کی منتظم اور مدبر خاتون تھیں۔ ۱۸۴۴ء میں نواب جہاں گیر محمد خاں کی وفات کے بعد سکندر جہاں نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی۔ نواب صاحب کی وفات کے بعد ان کی بیٹی جانشین مقرر ہوئیں لیکن کم عمری کی وجہ سے ان کی والدہ سکندر جہاں نے بھوپال کے انتظام کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ بھوپال میں عدالتیں اور پولیس کا محکمہ قائم کیا اور قابل ترین لوگوں کو عہدوں پر بحال کیا اور ساتھ ہی اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا۔

سکندر جہاں بیگم نے تعلیم کے میدان میں گراں قدر خدمات پیش کی ہیں۔ انھوں نے بہت سارے اسکول قائم کئے اور انگریزی کو ایک لازمی مضمون کے طور پر نصاب میں شامل کیا۔ نواب صدیق حسن خاں کو شہرت سکندر جہاں کے دور میں ہی ملی۔ سکندر جہاں نے دفتر تاریخ کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا تھا اور اسی ادارہ کا مہتمم نواب صدیق حسن خاں کو بنایا تھا۔[۲] سکندر جہاں کے دور میں بھوپال علم کا شہر بن گیا تھا اور علما کی قدردانی کی وجہ سے اہل علم اس شہر کا رخ کرتے تھے۔ سکندر جہاں نے اردو

زبان میں قانون کی کتاب لکھوائی اور دوسرے اہم دیوانی مسائل کی کتابوں کو بھی اردو میں تحریر کرایا۔ نواب صدیق حسن خان نے بہت سی اہم کتابوں کو شائع کیا۔

سلطان جہاں بیگم

آپ تیرہویں صدی کی نامور خاتون سکندر بیگم والی بھوپال کی نواسی اور احتشام الملک نواب احمد علی خاں کی زوجہ ہیں۔ ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئیں، نواب خاندان سے تعلق کی بنا پر بچپن سے ہی ان کی تعلیم وتربیت کی طرف خصوصی توجہ دی گئی، چنانچہ دینی تعلیم کے ساتھ ہی اردو، عربی وفارسی کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی۔ اس کے ساتھ ہی فنون سپہ گری، شہ سواری اور تیراندازی کے اسرار ورموز سے بھی خاطر خواہ واقفیت رکھتی تھیں۔ سلطان جہاں بیگم کے اندر خدمت خلق کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا جس کی وجہ سے رفاہی کاموں سے خاص شغل رکھتی تھیں۔ ضرورت مند طلباء و طالبات کے لیے مناسب وظیفوں کے انتظام کے ساتھ ہی یتیموں و بیواؤں کی دیکھ ریکھ اور ان کی ضروریات کی تکمیل کی طرف بھی توجہ کرتی تھیں۔ تجوید وقرات کے لیے ایک بڑا مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ بھوپال میں ابتدائی تعلیم کے حصول کے لیے متعدد اسکول و مدارس قائم کیے، ساتھ ہی اپنے ذاتی خرچ پر ابتدائی تعلیم کو ہر بچے کے لیے مفت اور ضروری قرار دیا۔[۳] امت کی فلاح اور اس کے ساتھ خیر خواہی کے جذبہ کے تحت انھوں نے طب یونانی کی تعلیم کے لیے مدرسہ طبی آصفیہ قائم کیا تاکہ بہترین اور عمدہ دواؤں کے حصول میں عوام کو پریشانی کا سامنا نہ ہو۔ عمدہ یونانی ادویہ کی فراہمی کے لیے یونانی ادویہ کی ایک دکان بھی کھلوائی اور خواتین کی خوش حالی کی طرف بھی توجہ کی۔ اس ضمن میں اسلم جیراج پوری لکھتے ہیں:

> عورتوں کی بسر اوقات کے لیے صنعت وحرفت کے نام سے ایک مدرسہ چندہ سے قائم کرایا تاکہ ریاست کے لوگ اپنی مدد آپ کرنے کے عادی ہوں۔ اس میں بھی زیادہ اپنی ہی امداد شامل رکھی۔ اس مدرسہ میں جو عورتیں کام سیکھنے کے لیے داخل ہوتی ہیں ان کو ماہانہ وظیفہ دیا جاتا ہے۔[۴]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم نسواں کی حمایت میں ان کا تعاون ہو یا ندوہ اور دیوبند میں ان کی تعلیمی سرپرستی، امت کی فلاح و بہبود کے لیے ان کی خدمت خلق کے جذبہ سے کی گئی تمام کارگزاریوں

نے انھیں اس میدان میں صف اول میں رکھا ہے۔

بی بی صغری

بی بی صغری کا شمار بہار شریف (صوبہ بہار) کی عظیم شخصیات میں ہوتا ہے۔۱۸۱۵ء میں ضلع مونگیر میں ان کی ولادت ہوئی۔ابتدائی تعلیم مقامی مدرسے میں ہوئی،اس کے علاوہ انھوں نے اردو، ہندی، فارسی اور انگریزی میں مختلف ڈگریاں حاصل کیں۔۲۱ سال کی عمر میں ان کی شادی بہار شریف کے مشہور زمین دار فضل امام کے بیٹے مولوی عبدالعزیز سے ہوئی۔وہ انگریزوں کی حکومت میں ان کے سرکاری ملازم تھے،لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد انھوں نے نوکری سے استعفیٰ دے کر انگریزوں کے خلاف آزادی کی مہم میں حصہ لیا۔

بیٹی اور شوہر کے یکے بعد دیگرے انتقال اور قریبی رشتہ داروں کی بے اعتنائیوں نے انھیں یکسر مایوس کر دیا تھا،لہٰذا خود کو مصروف رکھنے اور اپنے غم کو ختم کرنے کے لیے انھوں نے ۱۸۹۶ء میں صغری وقف ٹرسٹ اسٹیٹ (Soghra Waqf Estate 1896) کی بنیاد ڈالی اور اس کے متولی (Manager) کی ذمہ داری خود ہی سنبھالی۔زمین کے رجسٹریشن کے ریکارڈ کے حساب سے صغری وقف اسٹیٹ ۲۸،۵۰۰ بیگھا آراضی پر بہار کے مختلف اضلاع پٹنہ، مظفر پور، سمستی پور، گیا، شیخ پورہ اور بھاگلپور تک پھیلا ہوا تھا۔جبکہ ایک اندازے کے مطابق ۳،۰۰۰ بیگھا آراضی مختلف دیگر متولیوں کے ذاتی مفاد، غیر قانونی فروخت اور لڑائی جھگڑوں یا لاپروائی کی نظر ہو گیا۔لیکن اس کے علاوہ کافی بڑی آراضی سرکاری طور پر رجسٹرڈ ہے۔اس کے ساتھ ہی خود بہار کی گورنمنٹ نے بھی سرکاری کاموں کے لیے ان کی زمین سے اکتساب فیض کیا ہے۔تعلیمی وفلاحی اداروں کی ایک بڑی تعداد آج بھی صغری وقف اسٹیٹ کے تحت کام کر رہی ہے۔ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔

مدرسہ عزیزیہ

بہار کا مشہور اور قدیم ترین مدرسہ، مدرسہ عزیزیہ ۱۸۹۶ء میں پٹنہ میں اسی وقف کے ذریعہ قائم کیا گیا۔مدرسہ عزیزیہ ایک مشہور تعلیمی ادارہ ہے جس میں اساتذہ اور طلباء دونوں کے لیے ہاسٹل کی

بہترین سہولت موجود ہے۔۱۹۱۰ میں بہار شریف، نالندہ میں مدرسہ عزیزیہ کی عمارت کی تعمیر کا کام شروع ہوا اور۱۹۲۴ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔اس مدرسہ کو بی بی صغریٰ نے اپنے شوہر کے نام سے منسوب کیا تھا۔مدرسے میں اسلامی ماحول میں دینی وعصری تعلیم کے حصول کا بہترین انتظام ہے۔بی بی صغری کی وسیع النظری و دوراندیشی کا عالم یہ تھا کہ مذہبی تعلیم کے ارتقاء کے لیے مدرسہ عزیزیہ کے انتظام کو بخوبی چلانے کے لیے وقف کی سالانہ آمدنی کا چالیس فی صد حصہ صرف مدرسہ عزیزیہ کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔

صغریٰ ہائی اسکول

صغری ہائی اسکول ۱۹۱۷ء میں کاغذی محلّہ (بہار شریف) میں قائم کیا گیا جو ابھی بھی موجود ہے۔ابتدائی وقت میں یہ اسکول Soghra Growing English High School کے نام سے جانا جاتا تھا۔یہ مائینورٹی کا سرکاری طور پر منظور شدہ اسکول ہے جسے اپنے علاقہ کا دوسرا بڑا اور بہترین اسکول کا مقام حاصل ہے۔

صغری کالج

ہندوستانی دستور کی دفعہ ۲۹ اور ۳۰ کے تحت ۱۹۷۸ء میں صغری کالج قائم کیا گیا۔اس کو تقریباً آٹھ ایکڑ زمین پر قائم کیا گیا تھا۔۱۹۸۱ء میں یہ کالج مگدھ یونیورسٹی سے ملحق (affiliated) ہوا، یہ بھی سرکاری طور سے منظور شدہ ایک (Minority) کالج ہے۔اب پاٹلی پتر اپٹنہ یونیورسٹی کے زیرنگرانی اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔

ایک بڑی (Dormetory) کھرادی محلّہ کی جامع مسجد کے قریب قائم کی گئی جو آج بھی کافی اور کارگر ہے۔

بی بی فاطمہ بذات خود اپنی زیرنگرانی اس وقت پانچ مساجد کی دیکھ ریکھ اور ان کے کام کاج کی نگرانی رکھتی تھیں اور اس کا باقاعدہ عملی نظام ان کے ہاتھوں میں تھا۔

شاہی جامع مسجد، بہار شریف، پل پر

جامع مسجد مرار پور، بہار شریف

بخاری مسجد، کاغذی محلّہ، بہار شریف
موہنی مسجد، موہنی، نالندہ
جامع مسجد، ہسوری، شیخ پورہ

صغریٰ وقف اسٹیٹ کا بنیادی مقصد ہی سماج کی خدمت تھا، لہذا ان تمام خدمات کے ساتھ ہی ساتھ صغری وقف اسٹیٹ کے زیر نگرانی میڈیکل، طبی سہولت، اسکالرس اور طلباء کی بنیادی ضروریات اور ان کی اسکالرشپس اور دیگر فلاحی اور خدمت خلق کے امور انجام پاتے تھے۔ انھوں نے اپنے وقت کے سماج کو خاص طور سے مسلم معاشرہ کو بہتر بنانے میں گراں قدر خدمات انجام دی تھی۔ انھیں اپنے سماج کی سیاسی، معاشی اور تعلیمی ارتقاء کی بہت فکر تھی۔ ان کی زندگی کے آخری بارہ سال کو خاص طور سے اس زمانہ کا سنہرا دور کہا جاتا ہے ۱۹۰۸ء میں ۹۷ سال کی عمر میں ان کے انتقال کے ساتھ ہی اس کی چمک ماند پڑنے لگی۔ ان کو بہار شریف کی جامع مسجد کے برامدے میں ان کے شوہر کے ساتھ ہی دفن کیا گیا۔[۵]

رقیہ بیگم

رقیہ بیگم کا تعلق ہندوستان کے مشرقی حصہ بنگال سے ہے۔ وہ ۱۸۸۰ء میں بنگال میں پیدا ہوئیں، ان کا گھرانا کافی روایت پسند تھا، ان کے والد لڑکیوں کی تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ اس کے برعکس رقیہ بیگم اور ان کی بہنوں میں تعلیم کی طرف رجحان ناقابل فراموش تھا۔ اپنے شوق کو پروان چڑھانے کے لیے رقیہ اور ان کی بہن رات کی تاریکی میں اپنے بھائی سے انگریزی اور بنگالی زبان سیکھتی تھیں، جس سے والد یکسر ناواقف تھے۔

سولہ سال کی عمر میں شادی کر کے وہ کٹک چلی گئیں۔ ان کے شوہر سخاوت حسین ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔ کٹک میں ان کی ملاقات برہمو سماج کی ایک خاتون ریبا رائے سے ہوئی جو حقوق نسواں سے متعلق تحریک چلا رہی تھیں۔ رقیہ بیگم کو اس میں شامل ہونے کا موقع ملا جس سے ان کے شوق کو بال و پر لگ گئے۔ انھوں نے خاص طور سے مسلمان عورتوں کے درمیان تعلیمی بیداری اور اس میں عملی شمولیت کو لے کر تحریک چلائی۔ اس تحریک کو چلانے میں ان کے شوہر نے ہر موقع پر ان کا ساتھ دیا اور حوصلہ بڑھایا۔ کچھ ہی دنوں بعد ان کے شوہر کی وفات ہوگئی۔ شوہر کی وفات کے بعد رقیہ بیگم نے اپنے آپ کو

مکمل اس تحریک سے وابستہ کرلیا۔کلکتہ میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے انہوں نے سخاوت حسین میموریل گرلز اسکول قائم کیا۔اس کے علاوہ رقیہ بیگم نے آل بنگال مسلم لیڈرز اسوسیشن قائم کی جس کا عین مقصد لڑکیوں میں خاص طور سے تعلیم کے فروغ کی طرف توجہ کرنا تھا۔انہوں نے بنگال میں غریب بچوں کی تعلیم کے لیے کئی اسکول قائم کئے۔رقیہ بیگم نے اسکولوں اور ایسوسی ایشن کے ذریعے نہ صرف تعلیم کا ایک پلیٹ فارم تیار کیا بلکہ ساتھ ہی عورتوں اور بچوں کے درمیان تحریک چلائی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اسکولوں میں داخلہ لیں، تعلیم کی طرف متوجہ ہوں تا کہ خاطر خواہ سدھار ہو سکے۔ان کی کوششوں سے بہت سی عورتوں میں سماجی خدمت اور رفاہ عامہ کے کاموں میں دلچسپی پیدا ہوئی۔[۶]

فاطمہ شیخ

فاطمہ شیخ ۱۸۳۱ء میں پونے میں پیدا ہوئیں۔انہوں نے باہمی تعاون سے لڑکیوں کے لیے ایک اسکول کی ابتدا کی۔ستیہ شودھک سماج تحریک کے ذریعہ انھوں نے دروازے دروازے دستک دیا اور گھر گھر جا کر سماج پس ماندہ عورتوں اور بچیوں کو خاص کر تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔فاطمہ شیخ کا نام آتے ہی ایک بہترین معلّمہ اور سماج سدھار کا تصور سامنے آتا ہے۔فاطمہ شیخ کو پہلی مسلم اساتذہ کا مقام بھی حاصل ہے۔مشہور سماجی مصلح و معلّمہ جیوتی راؤ پھولے اور ساوتری بائی پھولے کے عہد سے ان کا تعلق ہے۔تینوں نے ساتھ مل کر سماج کی فلاح و بہبود اور ان میں علم کی شمع روشن کرنے کا کام انجام دیا تھا۔اس راہ میں انھوں نے بہت سی تکلیفوں کا بھی سامنا کیا۔یہاں تک کہ انھوں نے اپنے مکان کو ہی اپنی جائے پناہ اور تحریک کا مرکز بنایا۔فاطمہ پھولے نے بلاتفریق مذہب وملت سماج کے پس ماندہ لوگوں کو تعلیم کے میدان میں آگے بڑھانے کا بیڑا اٹھایا تھا تا کہ اس سماج اور معاشرہ کا سدھار ہو سکے۔

ساوتری بائی پھولے کو جب گھر بدر کیا گیا تو فاطمہ شیخ اور ان کے بھائی نے اپنے گھر کو ان کے لیے جائے پناہ بنایا بلکہ ۱۸۴۸ میں عثمان شیخ اور فاطمہ شیخ کے ہی گھر میں اسکول کھولا گیا۔اس راہ میں انھیں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔اس حیثیت سے ان کا کردار بھی خاص اہم ہو جاتا ہے کہ بلاتفریق مذہب وملت انھوں نے ہندوستانی سماج کی پسماندہ عورتوں کی خوش حالی کی فکر کرتے ہوئے ان کے لیے جدوجہد کی۔اس تعلیمی تحریک کے لیے انھوں نے غیر مسلم خواتین کے ساتھ شانہ بشانہ کام کیا۔[۷]

فاطمہ شیخ نے تعلیم نسواں کے ساتھ ہی بیوہ عورتوں کی دوسری شادی اور بازآبادکاری اور حقوق نسواں کے تحفظ کا بھی کام کیا۔ سماج میں عورتوں کے لئے عدم مساوات کے خلاف آواز اٹھائی۔ ۱۸۵۱ء میں بمبئی کے اسکولوں کے قیام میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

لیڈی انیس امام

پٹنہ کا انیسہ آباد انہی کے نام سے موسوم ہے۔ لیڈی انیس امام کو جدید بہار کے معماروں میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔ ان کا اصل نام انیس فاطمہ ہے۔ انھوں نے اپنے شوہر سید علی امام کے ساتھ مل کر بہار کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ لیڈی انیس امام نے بادشاہ نواز رضوی اسکول سے تعلیم حاصل کی جو پہلے مدرسہ اسلامیہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ وہ بیسویں صدی کی ان خواتین میں سے ہیں جنھوں نے سماجی برائیوں اور غیر منصفانہ رسم ورواج کے خلاف بہار میں آواز اٹھائی۔ انھوں نے ہندو و مسلم اور خاص طور پر عورتوں کے حقوق کے تحفظ کا نعرہ بلند کیا۔

آزاد ہندوستان کی تحریک کے لیے بھی انہوں نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اپنی بیٹی محمودہ سمیع کے ساتھ مل کر انہوں نے بہار میں شراب کے خلاف مہم چلائی۔ وہ ایک کمپنی کی ہیڈ بھی رہیں جو All India Congress to England کے ماتحت تھی۔ اس کی کارگزاریوں کے لیے وہ پٹنہ سے انگلینڈ سیاسی سفر کرنے والی پہلی خاتون تھیں۔ لیڈی انیس نے ۱۹۳۷ء میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے بہار کا الیکشن بھی لڑا۔ آزادی کے بعد انہیں Social Welfare Board کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس ذمہ داری کو ادا کرتے ہوئے لیڈی انیس امام نے سماجی فلاح و بہبود اور خدمت خلق کے بہت سے کام انجام دئے۔ مریم منزل (انیسہ آباد) سے بھی انھوں نے اپنی سماجی خدمات انجام دیں۔ انیسہ آباد کے علاوہ لیڈی انیس امام نے بہار کے دوسرے اضلاع وسب ڈویژن مثلاً باڑھ، مظفر پور اور دیگر شہروں میں فلاح و بہبود کے ارتقاء کے لئے مختلف کمیٹیاں بھی تشکیل دیں۔ وہ بہار کی Lesgislative Assembly کے لیے بھی منتخب ہوئیں۔ انھوں نے بہار میں تعلیم کے فروغ کی طرف خصوصی توجہ دی۔ وہ بہترین مقرر بھی تھیں اور اکثر خواتین اور طالبات کے درمیان زندگی میں تعلیم کی اہمیت وضرورت کو بھی بیان کیا کرتی رہتی تھیں۔ پٹنہ سے ان کی انسیت اور اس کے لیے کی گئی فلاح و بہبود کا اندازہ اس بات

سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے نام سے وہاں انیسہ آباد قائم کیا گیا۔ گردنی باغ کے پاس ان کے شوہر کی ایک پرانی آراضی تھی جس میں ایک عمارت انیس محل کے نام سے جانی جاتی تھی، بعد میں پورا علاقہ انہیں کے نام سے جانا گیا۔

سلطانہ بیگم

جب بھی تعلیم نسواں کی بات ہوتی ہے سلطانہ بیگم کا نام بے اختیار زبان پر آجاتا ہے۔ سلطانہ بیگم مشہور عالم ومورخ مولوی ذکاء اللہ کی بہو تھیں۔ سلطانہ بیگم کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا، ان کے شوق کو پروان چڑھانے میں شمس العلماء ذکا اللہ نے اہم کردار ادا کیا۔ انہیں لکھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ ''تہذیب النسواں'' میں ان کے مضامین چھپتے تھے۔ سلطانہ بیگم نے انجمن تعلیم نسواں کی بنیاد رکھی۔ پشاور ہجرت کرنے کے بعد وہاں بھی انھوں نے اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا اور لڑکیوں کا ایک مدرسہ قائم کیا۔ ۱۹۰۲ میں دہلی واپسی پر انہوں نے لیڈیز کلب کی بنیاد ڈالی اور اس کی سکریٹری رہیں۔ پروفیسر محسن عثمانی لکھتے ہیں:

> دہلی میں اپنی بیٹی کے نام سے نعیمہ مدرسہ قائم کیا۔ بعد میں اس کا نام اسلامیہ زنانہ مدرسہ ہوگیا اور آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس فنڈ علی گڑھ سے بیگم صاحبہ شیخ عبداللہ مدد کرتی تھیں۔ ان کا یہ کارنامہ قابل فخر ہے کہ جب مسلم گھروں میں تعلیم نسواں کی مخالفت ہو رہی تھی، انہوں نے تعلیم نسواں کی مہم چلائی اور مدرسے قائم کیے۔

بیگم حمیدہ حبیب اللہ (۱۹۹۹-۱۹۱۶ء)

ایک سماجی کارکن اور ماہر تعلیم تھیں، آپ علی گڑھ (اتر پردیش) کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ آپ نے اپنی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) سے حاصل کی اور بعد میں سوشل ورک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

بیگم حمیدہ حبیب اللہ نے آل انڈیا ویمنز کانفرنس (AIWC) اور انڈین کونسل فار چائلڈ

ویلفیئر کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے خواتین کی تعلیم کو فروغ دینے پر توجہ مرکوز کی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وویمن کالج کی فاؤنڈر ڈائرکٹر تھیں۔ سماجی شعبے میں کام کے علاوہ بیگم حمیدہ حبیب اللہ کا سیاسی کیریئر بھی ممتاز تھا۔ انھوں نے ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایوان بالا راجیہ سبھا میں ممبر پارلیمنٹ (ایم پی) کے طور پر خدمات انجام دیں اور خواتین، اقلیتوں اور سماجی انصاف سے متعلق مسائل پر وکالت کا فریضہ انجام دیا۔

مذکورہ بالا خواتین کے حالات اور ان کے سماجی اور رفاہی کاموں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستانی مسلم خواتین نے مختلف سماجی، ثقافتی اور اقتصادی چیلنجوں کا سامنے کرنے کے باوجود پوری تاریخ میں تعلیم اور سماجی کاموں میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

مصادر و مراجع

۱۔ **متفق علیه، کتاب التوحید، باب قول اللّٰه تبارک و تعالی من لا یرحم لا یرحم**

۲۔ مشاهیر خواتین اسلام —— پروفیسر محسن عثمانی (انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، جوگا بائی، جامعہ نگر، نئی دہلی) ص:۱۹۸

۳۔ قاموس الخواتین (جلد دوم) —— محمد افروز چریاکوٹی (نیو رضوی کتاب گھر، ۲۰۲۲) ص:۱۰۳۷

۴۔ خواتین —— اسلم جیراج پوری (سنگم کتاب گھر، اردو بازار، دہلی) ص:۳۴۲

۵۔ www.heritagetimes.in/bibi.soghra.a.towering-philanthropist-vanished-into-history/

۶۔ مسلم خواتین – ایکٹیویزم کی راهیں —— محی الدین غازی (مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی) ص:۹

۷۔ ایضاً، صفحات:۸۹۔۸۰

محمد علی *

اسلامی اور مسیحی تصورِ محبت کا فرق

عالمی شہرت یافتہ اشاعتی ادارے رٹلج (Routledge) کی جانب سے شائع ہونے والے ایک علمی مجلّے ''پولیٹکل تھیوری'' میں پروفیسر ابراہیم موسیٰ کا ایک مضمون جنوری ۲۰۲۴ء کے شمارے میں شائع ہوا۔[1] آپ کا یہ مضمون دراصل اکتوبر ۲۰۰۷ء میں ۱۳۸ مسلم علماء، دانشور اور لیڈران کی جانب سے شائع کئے گئے ایک عام خط، بعنوان ''ہمارے اور تمہارے درمیان کلمۂ سواء'' کے بنیادی نقطہ کی تنقید ہے۔ اس خط میں عیسائی اور مسلمانوں کے درمیان کلمۂ سواء ''محبت'' (love) کو قرار دیا گیا ہے۔ پروفیسر موسیٰ اس بات سے اتفاق نہیں کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ، اول تو قرآن کے مطابق عیسائی اور مسلمانوں کے درمیان کلمۂ توحید ''کلمۂ سواء'' ہے، محبت نہیں۔ دوم یہ کہ اگرچہ عیسائی اور مسلمانوں کی مذہبی و علمی روایات میں ''محبت'' کا تصور پایا جاتا ہے، لیکن دونوں ہی روایات میں اس تصور کو دو الگ الگ حیثیتیں حاصل ہیں۔ عیسائیوں کی کلامی روایت میں ''محبت'' کے تصور کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، یعنی یہ تصور عیسائی روایت میں خدا کے وجود کا حصہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی ذات کی معرفت کا ایک اہم جزء بھی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی کلامی روایت میں خدا کی ذات کے

* گیسٹ فیکلٹی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

حوالے سے موجود بنیادی تصور ''رحمانیت یا رحمت'' ہے۔ جس طرح عیسائی روایت کے مطابق خدا کی محبت کائنات کے وجود کا احاطہ کرتی ہے اس کے بالمقابل اسلامی کلامی روایت میں خدا کی رحمت تمام موجودات پر حاوی ہے۔ اسلامی روایت میں محبت کو رحمت کے مشابہ و مماثل تصور نہیں کیا جاتا۔ ''کلمۂ سواء'' کے مصنفین اسلام اور عیسائیت کے مابین تفہیم کی غرض سے جب تصور محبت کی تشریح اسلامی روایت کے بجائے عیسائیوں کی کلامی روایت کی روشنی میں کرتے ہیں تو وہ دراصل اسلامی روایت کو مسخ کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ اس مضمون میں پروفیسر موسیٰ نے اپنے اسی تنقیدی نقطے کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ذیل میں ان کے اس مضمون کا مختصر خلاصہ اور اس کے ایک حصے ''غزالی کا تصور محبت'' کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

خلاصۂ مضمون

تمہید کے بعد مصنف عیسائی اور اسلامی روایتوں میں تصور محبت کے متعلق واضح فرق کی نشاندہی کرتے ہیں۔ سطور بالا میں اجمالی طور پر اسی فرق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں عیسائی روایت میں محبت کا ایک خاص تصور و مرتبہ ہے جب کہ اسلامی دینیات میں ''رحمانیت'' کو مرکزی تصور کی اہمیت حاصل ہے۔ اسلامی اور عیسائی روایات کے درمیان یہ ایک بنیادی فرق ہے۔ اس کے بعد پروفیسر موسیٰ امام غزالی اور دوسرے متکلمین کی تحریروں سے اسلامی علمی روایت میں اس تصور ''رحمانیت'' کی وضاحت تو کرتے ہیں، لیکن عیسائی کلامی روایت میں تصور محبت پر تفصیل سے روشنی نہیں ڈالتے۔ غزالی کے تصور محبت کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غزالی کے فکری نظام میں وجدانی شعور محبت کے تین درجات ہیں: پہلا درجہ ادراک، دوسرا درجہ اطاعت (یعنی دین)، اور تیسرا درجہ محبت ہے۔ یعنی پہلے خدا کا ادراک ہوتا ہے، پھر اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور اس کے بعد اطاعت کے باغیچہ میں محبت کا پھول کھلتا ہے۔ اسلامی روایت میں محبت ایک تجرباتی عمل ہے جو خدا کی اطاعت و بندگی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، جب کہ اطاعت و بندگی کا جذبہ خدا کی صفت رحمت کی معرفت سے نشو ونما پاتا ہے۔ مصنف موصوف اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ اس خط کے مصنفین سے ایک بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ انھیں اسلامی کلامی اور صوفی اصطلاحات میں اشتباہ ہوا اور انھوں نے اسلامی فکر میں

موجود تصور رحمت کو محبت کے مترادف سمجھ لیا۔ حالانکہ یہ دونوں، رحمت اور محبت، فکر اسلامی میں دو الگ الگ تصورات ہیں۔ ''کلمۂ سواء'' کے مطالعے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اس کے مصنفین اسلامی تصور رحمت کو عیسائی روایت کے لاھوتی ڈھانچے میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ اور بلا شبہ ان کی یا اس طرح کی کوششیں اسلامی روایت کو مسخ کرنے کے مترادف ہیں۔ اس نقطہ کی توضیح کرنے کے لیے آپ مشہور فرانسیسی فلسفی مشیل فوکو کے بیان کردہ تصور ''آپریٹس'' (apparatus) کا سہارا لیتے ہیں۔ آپریٹس سے مراد ایک ایسا ذہنی تصوراتی خاکہ ہے جو چند الفاظ و اصطلاحات سے مل کر اپنے زمانی و مکانی اور روایتی سیاق میں ایک خاص معنی یا معانی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً اسلامی روایت میں ''محبت'' کی آپریٹس سے وہ معنی مراد ہوں گے جن کا تصور اسلامی کلامی و اخلاقی ادب کی روایت میں پروان چڑھا۔ بالکل اسی طرح عیسائی روایت کے سیاق میں یہی لفظ ''محبت'' بحیثیت تصور مختلف معنی پیدا کرے گا۔ لیکن اگر سیاق بدل دیا جائے تو وہی الفاظ و اصطلاحات ایک دوسرا معنی پیدا کریں گے۔ یعنی تصور محبت کا محل اسلامی روایت قرار دے کر اس کی تشریح غالب بیانئے، مثلاً عیسائی روایت، کیسیاق میں کی جائے تو اس سے خلط مبحث لازم آئے گا جو دونوں ہی روایتوں کے لیے نقصان دہ امر ہے۔ مصنف دراصل اسی بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ جب مسلمان عیسائی اور اسلامی روایت کی مشترکہ اصطلاحات پر غور کریں یا ان کی تشریح کی کوشش کریں تو اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ کہیں وہ غالب روایتی بیانیے سے مرعوب ہو کر اسلامی روایت کو مسخ تو نہیں کر رہے ہیں۔

پروفیسر موسی اس اہم نقطے کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں جو مکالمہ بین المذاہب سے منسلک علماء و غیر علماء مسلمانوں کی مرعوبیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مذکورہ افراد اکثر اپنی نفسیاتی مرعوبیت کے تحت اسلامی فکر کی سالمیت کو نظر انداز کر کے عیسائیوں کو خوش کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ اور اپنی اس کوشش میں اسلامی فکر کو عیسائی اور جدید بیانیوں کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں۔ اس امر کی پروفیسر موصوف اس طرح بھی وضاحت کرتے ہیں کہ موجودہ مسلمان، چاہے وہ خود کو راسخ العقیدہ کہتے ہوں یا پھر جدید فکر کا حامی قرار دیتے ہوں، دونوں ہی قسم کے افراد اسلامی تصورات کو عیسائی روایت کے لاھوتی بیانیے کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے ان کی غرض عیسائیوں کو اسلامی روایت کی تفہیم کرانا ہوتی ہے۔ لیکن اس میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ ان کے یہاں عیسائی فکر کا دقیق مطالعہ مفقود ہوتا ہے

اور وہ اسلام کی فکری خصوصیات اور انفرادیت کو فراموش کر دیتے ہیں۔

چند ملاحظات

یوں تو پورا مضمون بہت اہم اور اپنے موضوع پر قیمتی مباحث کا گنجینہ ہے لیکن اس مضمون کی جو خاص بات ہے وہ مصنف کا طرزِ تحریر ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ مسلمان اہلِ علم دو انتہاؤں پر نظر آتے ہیں، یا تو ان میں سے بعض مغربی بیانیے کو بلا تنقید جوں کا توں قبول کر لیتے ہیں، نتیجتاً وہ اپنی ہی علمی روایت کے متعلق شک وشبہ میں پڑ جاتے ہیں اور مغلوبیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ ذہنی مغلوبیت استعماریت کی ایک دوسری قسم ہے۔ یا پھر بعض اہل علم اسلام کی علمی روایت کی کورانہ تقلید کرتے ہوئے جدید افکار ونظریات کو اچھوت سمجھتے ہیں اور ان سے بھاگتے ہیں۔ اس دوسرے رویے سے بھی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری دنیا عہد وسطیٰ کی دنیا سے فکری وعلمی اعتبار سے بہت الگ ہے۔ بعض مسائل میں تو ان دونوں دنیاؤں کے درمیان میں زمین آسمان سا فاصلہ واقع ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی قدیم علمی روایت کبھی کبھی مسائل جدیدہ کے حل کرنے میں معاون ثابت نہیں ہو پاتی۔ اگر اس رویے پر اصرار کیا جائے تو بہت سے نظریات کی تفہیم بھی مشکل ہو جائے۔ لہٰذا اس نئے ماحول میں صحیح روش یہ ہو سکتی ہے کہ اہلِ علم قدیم وجدید دونوں ہی روایات سے اس طور پر روشنی حاصل کریں کہ قدیم روایت پر ان کا اعتماد برقرار رہے اور جدید روایت سے مغلوب ہو کر اپنے علمی ورثہ کے حوالے سے تذبذب کے شکار نہ ہوں۔ مزید برآں اس کا بھی خیال رکھا جائے کہ وہ قدیم روایت کے اسیر نہ ہوں، ورنہ جدید علمی روایت سے خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں کر پائیں گے۔ پروفیسر موسیٰ کے اس مضمون اور ان کی دیگر تحریروں کو پڑھ کر قاری یہی نتائج اخذ کرتا ہے۔ موصوف جہاں ایک طرف اسلام کی کلامی، فلسفیانہ اور فقہی روایت کے عالم ہیں وہیں دوسری طرف انھوں نے مغربی فلسفہ کے مطالعے میں ایک بڑا حصہ صرف کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں جا بجا مسلم ومغربی علماء وفلاسفہ کے حوالے آتے ہیں۔ یہ حوالے محض برائے توثیق نقل نہیں کیے جاتے بلکہ پروفیسر موسیٰ کی تحریروں کو پڑھتے وقت قاری کو احساس ہوتا ہے کہ اسلامی اور مغربی روایت میں ایک مکالمہ قائم ہو رہا ہے۔ یہ مکالمہ تقابل و تعلق کے ذریعہ روایتوں کے درمیان ایک رشتہ پیدا کرتا ہے، دونوں روایتوں کے درمیان موجودہ فرق کو

واضح کرتا ہے جس سے ان کی خوبیاں اور خامیاں ظاہر ہوتی ہیں اور اس طرح علم کی تشکیل وتعمیر کی نئی راہیں بھی کھلتی ہیں۔ اس کی ایک مثال ان کا مذکورہ مقالہ بھی ہے۔ مثلاً آپ مشیل فوکو کے تصور آرکیٹس کی مدد سے مسلمانوں کی فکری ہم آہنگی کی وضاحت کرتے ہیں یا پھر غزالی کے تصور محبت ومعرفت کی جدید فلسفیانہ تصور فینومینولوجی (phenomenology) کی روشنی میں تشریح کرتے ہیں جو غزالی کی اپنی تشریح سے مطابقت بھی رکھتی ہے۔

اس مضمون کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو آپ کی ایک عام تنقید اس رویے پر ہے جو اسلامی تصورات کو دور جدید کے غالب بیانیے جو کہ مغرب اور عیسائیت کا بیانیہ ہے، کی روشنی میں سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ اس رویے کے حامل لوگ یا تو احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں اور اسلامی روایت پر ان کو اعتماد نہیں ہوتا اور یا پھر وہ مغرب کی علمی روایت سے بہت زیادہ مغلوب ہوتے ہیں اور اسلامی فکر کو بھی صحیح طرح سے نہیں سمجھتے۔ یہاں تک کہ وہ اسلامی روایتی تصورات کو غالب بیانے کی شکل میں پیش کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ حالاں کہ وہ اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ ان کے ایسا کرنے سے قالب اگر چہ اسلامی ہوگا لیکن اس تصور کی روح مغرب زدہ یا پھر 'تجدید شدہ' ہوگی۔ اور پھر اس صورت میں 'تجدید شدہ' تصور کا رشتہ اسلام سے برائے نام ہی رہ جائے گا۔ دراصل غالب بیانیہ طبعاً یہی چاہتا ہے، یعنی سارے تصورات اسی کے رنگ میں رنگ جائیں۔ جبکہ پروفیسر موسیٰ اس بات پر زیادہ دیتے ہیں کہ مسلمانوں کو اسلامی روایت کو اس کی اپنی انفرادیت کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس میں اگر تجدید واصلاح کی ضرورت ہوگی تو وہ بھی انہی اصولوں کی روشنی میں ہونی چاہیے جو اس کی طبیعت کے موافق ہوں اور اسے مسخ نہ کرتے ہوں۔ اسلامی روایت کے سیاق سے ہٹا کر مغربی روایت میں اسلامی تصورات کی تشریح کرنے سے جو خرابی واقع ہوسکتی ہے اس کی ایک مثال آپ اوپر ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اس مضمون کے صفحہ ۱۵ پر آپ لکھتے ہیں:

> کسی بھی اسلامی تصور مثلاً 'محبت' کی تشریح نو اگر اس کے روایتی تصور اور نظام فکر سے ہٹا کر کی جائے تو سوءِ فہم لازم آئے گا۔

ذیل میں اصل مضمون کے ایک حصے کا ترجمہ، جو اسلام میں غزالی کے تصور محبت پر مشتمل ہے،

کو پیش کیا جا رہا ہے:

غزالی کا تصور محبت

جب غزالی تصور محبت کو اپنی مشہور زمانہ کتاب 'احیاء علوم الدین' کے باب 'محبت، شوق، انس اور رضا' میں بیان کرتے ہیں، تو وہ ان تمام مسائل کو سامنے رکھتے ہیں جو خدا سے قربت حاصل کرنے کے دوران انسان کو پیش آتے ہیں۔ فی الحال میں موجودہ بحث کے تناظر میں چند منتخب موضوعات کو ذکر کرنے پر اکتفا کروں گا۔

غزالی مذکورہ باب کی تمہید کا آغاز سلیس اور خوبصورت انداز میں کرتے ہیں۔[۲] وہ لکھتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کے دلوں پر الہام فرماتا ہے۔'' اور ان کے باطن کو دنیا کی محبت سے پاک کر دیتا ہے تاکہ ان کے قلوب صرف اللہ ہی کی ذات کی طرف متوجہ رہیں۔[۳] اس کے بعد غزالی خدائی جلال کی پر لطف نیرنگیوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو سالک کو حب خدا کی آگ میں جھلسا دیتی ہیں۔ یا پھر سالک کی عقل و مشاہدہ پر ایک خاص قسم کی دھول پڑ جاتی ہے اور وہ خدا کی وجاہت کا ادراک نہیں کرتا پاتا۔ اگر سالک ایسے حالات سے دوچار ہو تو غزالی اسے صبر کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ غزالی کہتے ہیں:

> ''خدا کی معرفت کے حصول کی راہ میں سالکین کے قلوب قبول و انکار او رحصور و تردد کی کیفیات کے درمیان معلق رہتے ہیں۔ وہ بیک وقت خدا کی معرفت کی اتھاہ سمندر میں غوطہ زن بھی ہوتا ہے اور اس کی محبت آگ میں جھلستا بھی رہتا ہے۔''[۴]

اسی احیاء علوم الدین کے ایک دوسرے حصے 'شرح عجائب القلب' کے خطبے میں غزالی توحید پرستی، معرفت کے ذریعہ کشف ذات الٰہی، عشق، حیرت، پیچیدگی اور تضاد جیسے موضوعات کا تعارف کراتے ہیں۔ تصور محبت ان تمام موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ خدا کے مشاہدے کے ذریعے خدا کی معرفت حاصل کرنا محبت کے آداب (economy of love) میں سے ہے۔ خدا کی معرفت دراصل اس دنیا میں انسانی 'حسن، کمال اور فخر' کی بنیاد ہے۔ انسان کا اخلاقی و سیاسی وجود خدا کا مشاہدہ کرتا ہے

جیسے جیسے خدا کی معرفت قوی تر ہوتی ہے، محبت کے آداب میں شائستگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اگرچہ معبود حقیقی کی ایک مستند تعریف متصور کی جاسکتی ہے، لیکن مکمل طور سے اس کی عقلی تفہیم ممکن نہیں ہے۔ اس کے باوجود، سالک اس سے محبت کے جذبے سے سرشار ہوتا ہے۔ پھر بھی غزالی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''سوائے معرفت اور ادراک کے محبت کا تصور ممکن نہیں ہے۔ ایک انسان صرف اسی چیز سے محبت کرتا ہے جس کا اسے علم ہو۔[۵]

غزالی کے نزدیک محبت وجد و تحیر کی کیفیتوں پر مشتمل ہے۔ غزالی کا تصور محبت ان کے تصور خدا، یعنی ایک ایسی ذات جو عقل و فہم سے ماورا ہو، سے بہت مطابقت رکھتا ہے۔ خدا کی حقیقی معرفت اور قرب محبت کے ذریعے ہی حاصل ہوتا ہے۔ تاہم محبت سے جو حیرت اور عاجزی پیدا ہوتی ہے وہ حل ہونے کے بجائے ایک تخلیقی تناؤ کی صورت میں باقی رہتی ہے۔ محبت کی آگ میں انسان جھلستا بھی ہے اور تکلیف بھی برداشت کرتا ہے اور کبھی وہ عقل کے بیابان میں ایک ہی وقت میں یقینی و تذبذب کی راہوں پر سرگرداں رہتا ہے۔ وہ کبھی عقل کی پیچیدگیوں میں الجھتا ہے تو کبھی محبت کی آگ اسے جھلسا دیتی ہے اور کبھی کشف و بست کی کیفیات سے دوچار ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ محبت کا محال ہونا ہی اس کے امکان کو وجود بخشتا ہے۔ اس کو اس طرح سمجھیں کہ جہاں ایک طرف آگ کا نور اپنے اطراف کو روشن کرتا ہے تو وہیں دوسری طرف اس نور کی چکاچوندھ چیزوں کو ناقابلِ مشاہدہ بھی بنا دیتی ہے۔

غزالی دوٹوک خدا اور رسول کی محبت کو فرض قرار دیتے ہیں۔[۶] لیکن پھر ساتھ ہی یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر کوئی چیز، یعنی محبت، وجود ہی نہ رکھتی ہو تو اسے فرض کیسے تصور کیا جاسکتا ہے؟ وہ مزید پوچھتے ہیں کہ اگر مان لیا جائے کہ اطاعت محبت کی زائیدہ ہے تو پھر محبت کو اطاعت کے ہم معنی کیسے تصور کیا جاسکتا ہے؟ غزالی کی تحریر اور قرآن و حدیث کے اقتباسات سے یہ تاثر ملتا ہے کہ محبت ہر شئ پر مقدم ہے، کیوں کہ قرآن مجید مومنین کے بارے میں فرماتا ہے کہ ''یہ وہ لوگ ہیں، جن سے خدا محبت کرتا ہے اور (بدلے میں) وہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔'' (قرآن، سورہ ۵، آیت ۵۴) غزالی اس آیت کا حوالہ بھی دیتے ہیں جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ''اور وہ جو ایمان لائے وہ اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔'' (قرآن، سورہ ۲، آیت ۱۶۵) اسی طرح حدیث میں وارد ہوا ہے

کہ ''تم میں سے کوئی شخص تب تک ایمان نہیں لاسکتا جب تک کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے نہ ہو جائے۔ [۷] اس کے بعد غزالی مختلف ذرائع سے متعدد روایات نقل کرتے ہیں جو احادیث رسول اور صوفیاء کے واقعات و حکایات پر مشتمل ہیں۔ یہ تمام روایات محبت کو ہی افضل قرار دیتی ہیں۔ یہاں غزالی جن دو مسائل کی نشاندہی کر رہے ہیں اور ان کی توضیح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ خدا سے محبت کرنا اور محبت بحیثیت فرض اور اطاعت ہے۔ اور ان دونوں ہی تصورات کے درمیان واضح تناؤ ہے۔ اس مسئلے کی وضاحت تب تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ غزالی کے تصور محبت کو ٹھیک سے نہ سمجھ لیا جائے۔

لذت دینے والی چیز کی طرف کسی شخص کے طبعی میلان کو محبت کہتے ہیں۔ جب یہ میلان شدت اختیار کر لیتا ہے تو اسے عشق کہا جاتا ہے۔ [۸] لہٰذا جو چیزیں ایک شخص کی طبیعت کے موافق ہوں گی وہ اس کے لیے محبوب ہو جائیں گی اور جو چیزیں اس کی طبیعت کے مخالف ہوں گی وہ اس کے لیے قابلِ نفرت ٹھہریں گی۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ بعض چیزوں کی طرف طبیعت محبت یا بغض کسی طور پر بھی مائل نہ ہو۔ لیکن محبت کا تصور تب تک نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ محبت معرفت اور ادراک کے تابع نہ ہو۔ آپ فرماتے ہیں کہ ''انسان بغیر علم کے محبت نہیں کر سکتا۔'' [۹]

مختصر یہ کہ غزالی کے نزدیک محبت کا وجدانی و تجزیاتی شعور (Phenomenology of love) ایک تجرباتی عمل ہے۔ لیکن یہ تجرباتی عمل معرفت کے وجدانی و تجرباتی شعور کے تابع ہے۔ وجدانی شعور و تجربہ سے میری مراد یہ ہے کہ یہ شعور و تجربہ بعض چیزوں پر منحصر ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، ہمارا علم اور ہمارے تجربات، ادراک، مختلف قسم کی معرفت، یہ تمام چیزیں طرز فکر کے طریقوں، یا پھر موجودات کی دریافت کی ہماری کوششوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ لہٰذا، بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر آگسٹین (Augustine) نے محبت کو ایک طرح کی اشتہا کے طور پر تصور کیا تو غزالی نے محبت کو معرفت، احساس، ادراک اور وجود کی جستجو کے طور پر جانا ہے۔ معرفت اور ادراک کے اس رجحان کی اساس ان حواس خمسہ سے متعلق ہے جن کا محرک خارجی ہے۔ لیکن محبت کا حقیقی محرک داخلی یا باطنی ہوتا ہے اور ان باطنی حواس کو عقل، نور، قلب اور بصیرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد غزالی محبت کے ان متعدد مظاہر کی تشریح کرتے ہیں جو انسانی تجربات سے پیدا

ہوتے ہیں۔آپ لکھتے ہیں:

''یہ جگ ظاہر ہے کہ انسان اپنے نفس سے محبت کرتا ہے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ بعض اوقات وہ اپنی ذات کے مفاد کے لیے دوسروں سے محبت کرتا ہے۔لیکن کیا یہ تصور ہوسکتا ہے کہ ایک شخص اپنے ذاتی مفاد کو نظر انداز کرتے ہوئے خود کے بجائے دوسروں سے صرف ان کی ذات کی بنا پر محبت کرے؟ ضعیف العقل افراد کے لیے یہ ایک مشکل بات ہوگی، کیوں کہ ان کے خیال میں یہ بات قابلِ تصور ہی نہیں ہے کہ انسان اپنی ذات کے علاوہ کسی دوسرے سے صرف اس کی ذات کی وجہ سے محبت کرے اور اس محبّ کو اپنے محبوب کی ذات کے ادراک کے علاوہ اور کوئی فائدہ حاصل نہ ہو۔لیکن حق بات یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس بات کا تصور ہوسکتا ہے، بلکہ عملاً یہ حقیقت بھی ہے۔''[۱۰]

غزالی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بعض اوقات ایک شخص دوسرے سے صرف اس کی ذات کے لیے محبت کرتا ہے، اور اس میں اس کا کوئی ذاتی مفاد شامل نہیں ہوتا۔آپ خود ہی سوال قائم کرتے ہیں کہ..کیا اس بات کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ انسان کسی سے ذاتی مفاد کے لیے نہیں بلکہ صرف اس کی ذات کی وجہ سے اس سے محبت کرے؟ اس کے بعد رقم طراز ہیں:

...یہ بات مسلم ہے کہ ہر جاندار کے لیے سب سے پہلا محبوب اس کا اپنا نفس اور ذات ہے۔اور اپنے نفس سے محبت کا جذبہ اس حقیقت سے پھوٹتا ہے کہ انسان طبعی طور پر اپنے وجود کا دوام چاہتا ہے۔نیز وہ اپنے معدوم ہونے اور ہلاک ہونے سے نفرت کرتا ہے۔اس لیے انسان اپنے وجود کا دوام چاہتا ہے اور موت و ہلاکت کو ناپسند کرتا ہے۔کوئی موت کو صرف اس وقت پسند کرتا ہے جب اسے دنیا میں کوئی سختی یا تکلیف پہنچ رہی ہو۔[۱۱]

غزالی محبت کا جو تصور پیش کر رہے ہیں اسے میں وجدانی شعور و تجربہ پر مبنی محبت سے تعبیر

کروں گا۔ وہ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ کس طرح ہمیں دنیا میں محبت کا تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ ساتھ ہی وہ محبت کی فطرت اور ان اقسام سے متعلق بھی اپنے افکار پیش کرتے ہیں جو انسانوں کے درمیان موجود محبت کے ان کے اپنے مشاہدات پر مبنی ہیں۔ یہی تصوراتی تنظیم جو غزالی کے افکار سے وجود میں آتی ہے خدا اور انسان کے درمیان رشتۂ محبت کی تفہیم میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے۔

سب سے پہلے غزالی اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ کیسے انسان اپنی ذات سے محبت کرتا ہے، جسے وجود سے محبت کا وجدانی شعور و تجربہ (Phenomenology) کہا جاتا ہے۔ اپنے وجود کی بقا کا رجحان محبت کی ایک حقیقی تحریک سے وجود پاتا ہے جس کا ہر انسان تجربہ کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ اسے ذاتی یا خود غرض محبت بھی کہیں۔ غزالی کے نزدیک محبت کی یہ قسم وجود کے اظہار، کشف کے اقسام، فرد اور اس کی ذات اور مختلف ذاتوں کے درمیان تعلقات سے متعلق ہے۔ لہٰذا اپنے جسم، اعضائے جسم، اولاد، خاندان اور احباب کی محبت، یہ تمام محبت کے اس وسیع دائرے کا حصہ ہیں۔ کیوں کہ یہ تمام ہی انسان کے وجود کو دوام اور اس کی تکمیل میں معاونت کرتے ہیں۔

محبت کی دوسری قسم وہ احساس ہے جو انسان کے اندر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ کسی کی ذات سے کوئی فائدہ یا احسان حاصل کرتا ہے۔ احسان سے مستفید ہونے والے کے قلب میں اپنے محسن، جس سے وہ شکر کا اظہار کرتا ہے، سے ایک لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔ یہ اظہار ایک جذباتی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے جسے ہم محبت سے تعبیر کرتے ہیں۔ لہٰذا مستفید ہونے والے شخص (محبّ) اور محسن (محبوب) کے مابین ایک گراں مایہ چیز کا تبادلہ ہوتا ہے۔ یہ تقریباً ایک تحفہ حاصل کرنے جیسا ہے۔ اس قسم کو افادیت پسندانہ (utilitarian اور instrumental) محبت قرار دیا جاتا ہے جس کی بنیاد احسان پر ہوتی ہے۔ انسان اس سے محبت کرتے ہیں جو ان پر احسان کرتا ہے، پھر چاہے احسان کرنے والا کوئی اجنبی ہی کیوں نہ ہو۔ احسان یا مہربانی ایک اہم تصور ہے کیوں کہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو ایک انسان کی جانب سے دوسرے انسان کے لیے سرزد ہوتا ہے۔ وہ توجہ، ارادہ اور عمل جو مستفید کو حاصل ہوتے ہیں، محسن کو محبوب بناتے ہیں۔[۱۲]

تیسری قسم کسی سے صرف اس کے نیک ہونے یا اس کی ذات کی وجہ سے محبت کرنا ہے۔ محبت کی یہ قسم نیکی کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ محبت نیکی کی ماہیت ذاتی سے ہوتی ہے۔ ایک شخص لوگوں میں

موجود عمدہ خصائص اور امتیازی عادات سے محبت کرتا ہے۔ لیکن غزالی خاص طور سے دو خصوصیات پر توجہ دیتے ہیں جو اس پورے قالب کو تشکیل دیتی ہیں۔ ان میں پہلی خصوصیت علم اور دوسری قدرت ہے۔ ہم انسان کی اعلیٰ خصوصیت سے محبت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سیاسی رہنماؤں اور علماء سے خود کو وابستہ کرتے ہیں، ان کی حمایت کرتے ہیں اور انھیں پسند بھی کرتے ہیں، چاہے ہم ان سے ملے نہ ہوں اور نہ ہی ہم نے ان کا زمانہ پایا ہو۔ پھر بھی ہم ایسے لوگوں سے اپنی رغبت اور ان سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔

کسی شخص سے صرف اس کے حسن و جمال کی وجہ سے محبت کرنا، یہ چوتھی قسم ہے۔ ہم حسن اور جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں اور وہ ہمارے حواس کو خارجی طور پر متاثر کرتے ہیں۔ جب کہ قلب باطنی اور جذباتی طور پر حسن و جمال کا تجربہ کرتا ہے، جو جذباتی احساس کی ایک قسم ہے۔ اس اعتبار سے حسن اور جمال بذاتِ خود ہدف تصور کیے جاتے ہیں جو کہ محبت ہی کے مترادف ہے۔ دوسرے لفظوں میں، محبت کا مبدا حسن اور جمال ہیں۔ میرے خیال میں جمالیات محبت کی بہترین تعبیر ہوسکتی ہے۔ غزالی فرماتے ہیں:

> ''اس کی ایک واضح مثال انبیاء، علماء اور ان لوگوں سے ہماری محبت ہے جو اعلیٰ خصائص اور خوش کن طبیعتوں کے حامل ہوتے ہیں، اور یہ بات ان انسانوں کے ظاہری امتیازات کے باوجود فی الحقیقت قابل تصور ہے۔ باطنی جمال سے یہی چیز مراد ہے۔''[۱۳]

غزالی محبت اور محبوب کے مابین ''پوشیدہ مناسبت یا تعلق'' کو پانچویں قسم قرار دیتے ہیں۔ دو دلوں کے درمیان محبت ایک روحانی تعلق کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں محبت ایک ماورائی رابطے کے ذریعے وجود میں آتی ہے، جہاں روحیں بواسطہ حسن و خوبیٔ اوصاف ایک دوسرے سے وابستہ رہتی ہیں۔

محبت کی وہ قسم جس کی غایت خود محبت ہو، غزالی اس پر سب سے زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

> ضروری یہ ہے کہ کسی چیز سے اس کی ذات کی وجہ سے محبت کی جائے نہ کہ کوئی اور فائدہ حاصل کرنے کے لیے۔ حقیقت کا تجربہ کرنا خود میں ایک

فائدہ مند امر ہے۔ یہ محبت، محبت حقیقی ہے۔ اس میں ترقی کے ساتھ قوت پیدا ہوتی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے حسن یا ہر اس چیز سے محبت کی جائے جو خوبصورت ہو۔ جو شخص حسن کا اس کے حسین ہونے کی وجہ سے ادراک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اس کے لیے حسن و جمال سے متعلق ہر ہر شئی محبوب ہوتی ہے۔ حسن کا ادراک لذت کی حقیقت کا احاطہ کرتا ہے۔ اور لذت سے بذاتہ محبت کی جاتی ہے، نہ کہ اس کی حقیقت کے سوا کسی اور وجہ سے۔[۱۴]

غزالی محبت کے جس وجدانی شعور و تجربہ کی وضاحت کرتے ہیں اس میں دو چیزیں اہم ہیں۔ اولاً تو یہ کہ محبت کی آپریٹس (apparatus) وجود و فعل اور جوہر و عمل میں کسی بھی طرح کی تقسیم نہیں کرتی ہے۔ مسلم کلامی روایت میں خدا کی ذات میں ذات اور عمل کی تفریق نہیں کی جاتی ہے، جیسا کہ عیسائی روایت میں ہوتا ہے کہ تثلیث کے عقیدہ کی خدا کے تصور کے ساتھ مطابقت پیدا کی جا سکے۔ اس عقیدے کے مطابق خدا اپنی ذات اور جوہر کے اعتبار سے ایک ہے، لیکن اویکونومیا (oikonomoia) یعنی جس طرح سے وہ اپنے گھر، اپنی زندگی اور اپنی مخلوق کا انتظام و انصرانی کرتا ہے، اس اعتبار سے وہ تین پر مشتمل ہے۔[۱۵]

غزالی کی بحث کا دوسرا اہم پہلو محبت کے ساتھ اخلاقی عمل اور کارکردگی کو مربوط کرتا ہے۔ غزالی فرماتے ہیں: ''مختصراً، اطاعت سے متعلق تمام قابلِ تحسین اعمال اور مکارم اخلاق محبت ہی کا ثمرہ ہیں۔''[۱۶]

سرسری طور سے دیکھنے پر اس جملے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ غزالی محبت کو ایک مرکزی حیثیت دے رہے ہیں اور اسے تعبد کا ماخذ تصور کرتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض لوگ اس جملہ کو 'کلمۂ سواء' کے مصنفین کے دعوے کی توثیق پر محمول کریں۔ لیکن کوئی اس نتیجے پر تب ہی پہنچ سکتا ہے جب کہ وہ غزالی کے اس تصور یعنی دین بحیثیت اطاعت کو نظر انداز کر دے، یا پھر غزالی کے فکری نظام میں تصور رحمت کی مرکزیت اور جذبۂ اطاعت، جو اطاعت شعار بندے کے دل میں خدا کی محبت القا کرتا ہے، اس کی پرداخت سے نظریں چرا لے۔ اس مقام پر غزالی کے اس سوال کو دہرائیں جس کا ذکر ابتدا میں گزر چکا

ہے۔اطاعت محبت کی زائیدہ کیسے ہوسکتی ہے؟اس کے جواب میں آپ خود ہی وضاحت فرماتے ہیں کہ روح اور بدن میں محبت کی پرورش و پرداخت اطاعت گزاری کے ذریعہ ہوتی ہے۔(یعنی معاملہ مذکورہ سوال کے برعکس ہے،مترجم) درحقیقت مجازاً یہ کہنا درست ہوگا کہ محبت اطاعت کی نمائندہ ہے۔

غزالی خود ہی محبت اور اطاعت کے مابین تعلق کے سوال کے متعدد جواب دیتے ہیں۔آپ فرماتے ہیں:

> بعض علماء کا خیال ہے کہ محبت صرف ہم جنس وجود کے درمیان ہی قابل تصور ہے۔ لہٰذا اصولی طور پر خدا اور انسان کے درمیان محبت قائم نہیں ہوسکتی کیوں کہ دونوں ہی کی ماہتیں جدا جدا ہیں۔[۱۷]

لیکن واضح ہے کہ غزالی اس نظریے سے متفق نہیں ہیں۔کیوں کہ اسلامی روایت میں متعدد مثالیں موجود ہیں جو خدا اور بندے کے مابین محبت کے تعلق کی طرف نہ صرف یہ کہ دعوت دیتی ہیں بلکہ اسے ثابت بھی کرتی ہیں۔

غزالی کا سب سے مضبوط جواب تصور محبت کے لیے علمی بنیادیں فراہم کرنا ہے۔آپ فرماتے ہیں کہ محبت کا تصور علم اور ادراک کے بغیر ممکن نہیں۔محبت از خود خدا اور بندے کے مابین تعلق میں داخل نہیں ہوجاتی۔محبت کے واقع ہونے کے لیے بعض چیزوں کا موجود ہونا لازمی ہے۔ محبت کے حصول سے پہلے معرفت اور ادراک کی ایک خاص قسم کا وجدانی شعور و تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ معفرت کے وجدانی شعور و تجربہ یا معرفت کی آپریٹس (ذہنی تصوراتی خاکے) کے فہم کے بغیر،محبت نہ تو قابل تشریح ہوسکتی ہے اور نہ ہی قابلِ تجربہ۔غزالی وضاحت کرتے ہیں کہ ''صرف انسان اور ذی حس وجود ہی کو ادراک کی صلاحیت حاصل ہوتی ہے۔''[۱۸] غزالی کے یہاں معرفت اور ادراک کے وجدانی شعور و تجربہ سے تصور محبت کا گہرا تعلق پایا جاتا ہے، جو ان کے فلسفہ اخلاق، اصول فقہ، اور احیاء علوم الدین میں علم اخلاق پر ان کے مفصل ترین استغراق میں پیوست نظر آتا ہے۔[۱۹] انسان اس چیز کی طرف میلان رکھتے ہیں جو ان کی طبیعت کے موافق ہو اور اس چیز سے دوری بناتے ہیں جو انھیں ناپسند ہو یا باعث تکلیف ہو۔غزالی فرماتے ہیں: ''ہر وہ ادراک جس میں لذت و سکون شامل ہو، مدرک کو محبوب ہوتا ہے؛ اور ہر وہ ادراک جو تکلیف دہ ہو، مدرک کی نگاہ میں حقیر ٹھہرتا ہے۔[۲۰]

آپ مزید وضاحت فرماتے ہیں کہ مدرک ایسے ادراک سے لاتعلق رہتا ہے جو نہ تو باعث لذت ہو اور نہ ہی باعث تکلیف۔

وہ کون سے عوامل ہیں جن کے سبب ایک شخص معرفت اور ادراک پر سنجیدگی سے غور وفکر کرنے پر مجبور ہوتا ہے؟ خدا سے محبت اور اس کے رسول سے محبت کے رشتہ پر مقدم کون سی شئ ہے؟ ان تمام چیزوں پر جو شئ مقدم ہے وہ سننے اور اطاعت، یعنی دین کی دعوت، پر سنجیدگی سے غور وفکر کرنے کی صلاحت کا ہونا ہے۔ محبت اسی کلامی آپریٹس اور قالب کے درمیان پروان چڑھتی ہے۔

مذکورہ بحث کے بعد غزالی کے اس دعوے کے حوالے سے کہ اخلاقی عمل (جو اطاعت خدا یا اطاعت دین کی صورت میں وقوع پذیر ہوتا ہے، مترجم) محبت کے پنپنے اور نشو ونما پانے کا مقام ہے، میری دلیل شاید مزید واضح ہو جائے۔ معرفت وادراک اور اطاعت کا جذبہ محبت کے وقوع پر مقدم ہے۔ چنانچہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ محبت روایت میں پیوست ایک خاص قسم کی معرفت و ادراک اور اطاعت کا نتیجہ ہے، لیکن یہ خیال کرنا کہ اطاعت اور اخلاقی عمل محبت کے مشابہ ہیں، صحیح نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی محبت کا اقرار کرے، لیکن اس کا اظہار اخلاقی عمل کے ذریعہ نہ ہو تو ایسا اقرار محبت ریاکاری پر مبنی ٹھہرے گا اور بے بنیاد قرار پائے گا۔ یہ لازم ہے کہ اطلاعت گزاری میں روایت کی پابندی کی جائے۔ غزالی کے خیال میں جو بھی چیز اطاعت کی زمین پر نہیں اگتی، وہ صرف شہوت نفسانیہ اور اخلاقی پستی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ محبت تمام اخلاقی قیود سے آزادی کا عذر نہیں ہوسکتی، بلکہ صورت حال اس کے برعکس ہے۔ دوسرے لفظوں میں محبت مکلّف کے اوپر اطاعت اور پرہیز گاری کو عائد کرتی ہے۔ خدا کی اطاعت، جسے بائبل کی اصطلاح میں ناموس (Nomos) کہا گیا ہے، دراصل محبت کا ہی ایک عمل ہے۔

خدا اور انسان کے مابین تعلق کی جو تشریح غزالی پیش کرتے ہیں اسے ہم محبت کے وجدانی شعور وتجربہ سے تعبیر کریں گے۔ اس وجدانی شعور وتجربہ کے ساتھ یہ خیال بھی وابستہ ہیں کہ خودشناسی اس معروف روایتی تعلیم کے ساتھ مربوط ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''جسے اپنی ذات کی معرفت حاصل ہے، اسے اپنے رب کی بھی معرفت حاصل ہوتی ہے۔'' انسان خدا کے تابع ہیں۔[۲۱] خودشناسی کے فقدان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے خالق اور رب کائنات کی معرفت سے بھی جاہل رہ جاتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ

خود شناسی محبت کے تصور کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے، بلکہ معرفت ہمیشہ ہی انسانی صلاحیت اور قدرت سے متعلق ہوتی ہے۔

غزالی رقم طراز ہیں:

''محبت خدا کی معرفت کا ثمرہ ہے، محبت تب ختم ہو جاتی ہے جب خدا کی معرفت معدوم ہو جائے۔ خدا کی معرفت میں کمی آنے کے ساتھ ہی محبت میں بھی ضعف ہوتا ہے اور خدا کے معرفت میں قوت پیدا ہونے کی وجہ سے محبت کو بھی تقویت حاصل ہوتی ہے۔[۲۲]

غزالی کے اس قول سے واضح ہوتا ہے کہ کس طرح محبت معرفت اور ادراک کی اقسام پر منحصر ہوتی ہے۔ ساتھ ہی یہ اس دعوے کے بطلان کو بھی ثابت کر دیتا ہے کہ جس کے مطابق محبت کا تصور اسلام اور عیسائیت میں یکساں ہے۔ بلکہ ایسا دعویٰ دراصل دونوں ہی روایتوں کی تقلیل کرتا ہے۔ محبت کو جو مقام اسلامی کلام کی آپریٹس اور اسلامی معمولات میں حاصل ہے وہ اس مقام سے بہت مختلف ہے جو تصور محبت کو عیسائیوں کی متعدد کلامی روایات میں حاصل ہے۔

غزالی محبت اور حسن کے درمیان ایک گہرا تعلق قائم کرتے ہیں، اور اپنی اس تنظیم میں خواہش اور جمالیات کو بھی شامل کرتے ہیں۔ حالانکہ حسن سے محبت بذاتہ ایک مخصوص امر ہے اور اس قسم کی محبت ایک طبعی اور جبلی چیز ہے۔ خارجی آنکھ جس حسن کا مشاہدہ کرتی ہے وہ اس کی مادی صورت ہوتی ہے جب کہ ''دل کی آنکھ'' باطن کا مشاہدہ کرتی ہے۔ اور یہ محبت کی اعلیٰ اور ترجیحی قسم ہے۔

تجرباتی تناظر میں وہ حسن جس کا مشاہدہ قلب کرتا ہے اس کی مثال انبیاء، علماء اور اعلیٰ اخلاق و شگفتہ مزاج کے حاملین کے لیے ہماری محبت ہے۔ غزالی وضاحت فرماتے ہیں کہ نثر یا نظم کے عمدہ نمونوں اور مصوری یا پھر فن تعمیر کے کارناموں کو سراہنے کی ہماری صلاحیت اس حقیقت کو آشکار کرتی ہے کہ فنی نمونے ہمارے سامنے ''اپنی باطنی خصوصیات'' کو نمایاں کرتے ہیں۔ فنون کے ان نمونوں کی خوبصورت صفات دیکھنے والے پر ظاہر ہوتی ہیں کیوں کہ یہ فن پارے ''علم اور قدرت کی ایک ایسی جستجو'' سے وابستہ ہوتے ہیں جسے ان کے مصنف اور موجد نے علم اور قدرت کے چشمے سے حاصل کیا ہوا ہے۔

لہٰذا معلوم اپنے حسن اور اپنی عظمت کے اعتبار سے جتنا رفیع اور کامل ہوگا، علم بھی اتنا ہی مقدس اور خوبرو ہوگا۔ یہی بات قدرت پر بھی صادق آتی ہے۔ اگر قدرت اپنے مرتبے میں شاندار اور رتبے میں عظیم ہو، تو اسے حاصل کرنے کے لیے مطلوبہ قدرت بھی اسی طرح مکرم اور باوقار ہونی چاہیے۔[۲۴]

جب لوگ محبت کرتے ہیں اور اپنے پورے وجود سے حسن کی تحسین کرتے ہیں، تو دراصل یہ لوگ ان صفات کی تحسین کر رہے ہوتے ہیں جو صادقین میں پائی جاتی ہیں۔ غزالی علم اور قدرت کو جہاں ایک طرف حسن اور محبت کی معرفت کا ذریعہ سمجھتے ہیں تو وہیں دوسری طرف انھیں ناپاک اور بری خصلتوں سے پرہیز کرنے کا ذریعہ بھی مانتے ہیں۔ یہ تمام پہلو آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ الہام کا ایک منبع خدا، اس کے انبیاء، آسمانی کتابیں، شریعہ اور ملائکہ کی معرفت ہے۔ اور دوسرا منبع اپنے اور دوسروں کے لیے ہدایت کے ذریعہ تربیت حاصل کرنے کی صلاحیت ہے۔ اپنے اور دوسروں کے قلب پر حکومت اور ان کی تنظیم کرنے کی صلاحیت برے رویے کو تہذیب و تزکیہ کے ذریعہ دور کر دیتی ہے۔[۲۵] جو لوگ ایسی صفات کے مالک ہو جاتے ہیں وہ انبیاء سے محبت کرتے ہیں، علماء کو عزیز رکھتے ہیں، ''اصحاب عدل و احسان''، یعنی حکمران اور سیاسی رہنماؤں میں جو عدل و احسان کے معیار تک پہنچتے ہیں، ان کی ستائش کرتے ہیں۔ حالانکہ علم، قدرت اور انسانی حدود سے تجاوز کرنے والی انسانی صفات کا مقابلہ خدائی علم اور قدرت سے نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ خدا کی صفت علم و قدرت بے عیب، بے مثال اور ناقابل تصور ہیں۔[۲۶]

حواشی

۱۔ مضمون کا عنوان: Decolonizing the Politics of Love: A Ghazalian Genealogy of Love in Islam ہے۔ مصنف یونیورسٹی آف نوٹرے ڈیم انڈیانا، امریکہ، سے اسلامی فکر اور معاشرے کے استاد کی حیثیت سے وابستہ ہے۔

۲۔ al-Ghazali, Abu Hamid Muhammad b. Muhammad. al-Ghazali Love, Longing, Intimacy and Contentment Kitab al-mahabba wal-shawq wal-uns wal-rida Book XXXVI of the Revival of the Religious Sciences Ihya ulum al-din. Translated by Eric L. Ormsby. Cambridge: The Islamic Texts Society, 2011. 1.

۳۔ Al-Ghazali and Ormsby, Love, Longing, In..macy and Contentment, 1.

۴۔ Ibid.

۵۔ Al-Ghazali Kitab al-Mahabba, 4:259.

۶۔ Ibid., 4:257.

۷۔ Ibid., 4:258

۸۔ Ibid., 4:259

۹۔ Ibid

۱۰۔ al-Ghazali and Ormsby Love, Longing, In..macy and Contentment 12–13.
اس جگہ پروفیسر موسیٰ نے معمولی تبدیلی کے ساتھ اور مسیحی کا ترجمہ استعمال کیا۔

۱۱۔ al-Ghazali, Kitab Al-Mahabba, 4:260; al-Ghazali and Ormsby Love, Longing, In..macy and Contentment, 13.

۱۲۔ Lingis, Alphonso. "Subjectification." Continental Philosophy Review 40, no. 2 (2007): 113-123. doi:10.1007/s11007-007-9054-5. P. 11; also, Agamben, Giorgio. What Is an Apparatus?: And Other Essays. Stanford, CA: Stanford University Press, 2009.

۱۳۔ al-Ghaz?l?, Kit?b al-Mahabba, 4:265; al-Ghaz?l? and Ormsby Love, Longing, Intimacy and Contentment, 30.

۱۴۔ al-Ghazali, Kitab al-Mahabba, 4:261; al-Ghazali and Ormsby Love, Longing, In..macy and Contentment, 16.

۱۵۔ Agamben, What Is an Apparatus?, 9–10.

۱۶۔ al-Ghazali, Kitab al-Mahabba, 4:295; al-Ghazali and Ormsby Love, Longing, In..macy and Contentment, 130.

۱۷۔ al-Ghazali, Kitab al-Mahabba, 4:257; al-Ghazali and Ormsby Love, Longing, In..macy and Contentment, 2.

۱۸۔ al-Ghazali, Kitab al-Mahabba, 4:259; al-Ghazali and Ormsby Love, Longing, In..macy and Contentment, 10.

۱۹۔ al-Ghazali, al-Mustasfa min .Ilm al-Usul, 1:167–178.

۲۰۔ al-Ghazali, Kitab al-Mahabba, 4:259; al-Ghazali and Ormsby Love, Longing, In..macy and Contentment, 10.

۲۱۔ al-Ghazali, Kitab al-Mahabba, 4:263.

۲۲۔ Ibid

۲۳۔ Ibid., 4:265

۲۴۔ Ibid

۲۵۔ Ibid., 4:266

۲۶۔ Ibid, 4:265

تعارف وتبصرہ

نام کتاب	:	ارمغاں پروفیسر ایمیریٹس اختر الواسع ایک مطالعہ (ملی، علمی وانتظامی کارنامے اور فکری جہات)
تصنیف	:	رفیق احمد رئیس سلفی
ایڈیشن	:	۲۰۲۳ء
صفحات	:	۲۴۰
قیمت	:	پانچ سو روپے
تعارف وتبصرہ:		محمد مشتاق تجاروی

پروفیسر اختر الواسع ایک عبقری شخصیت ہیں، اسٹیج کی زینت ہیں، خطابت میں ان کو جو کمال حاصل ہے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، کوئی بھی موضوع ہو اس پر جچی تلی اور فیصلہ کن رائے دینا ان کا کمال ہے، وہ بہترین خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین استاد بھی ہیں۔ انھوں نے کم وبیش چالیس سال جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز میں درس وتدریس میں گزارے۔ تدریس میں

ان کا دامان نظر اتنا وسیع ہے کہ انھوں نے بہت سے لوگوں کی تعمیر شخصیت کی تدریس کے علاوہ تحریر و تحقیق میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں ہیں۔ انھوں نے متعدد و اہم اور پائیدار نوعیت کے تحقیقی کام کیے اور بعض اہم کام مرتب کیے ہیں۔ ان کی کئی علمی کاوشیں دستاویزی حوالہ ہیں۔

پروفیسر اختر الواسع کی گوناگوں علمی خدمات کا اعتراف تو مختلف حلقوں میں کیا جاتا رہا ہے۔ ان پر لوگوں نے خاکے لکھے، ان کی کتابوں پر تبصرے لکھے، بلکہ ان کے اوپر ڈاکومنٹری بھی بنائی گئی۔ اس سلسلے کی ایک کڑی رفیق احمد رئیس سلفی کی کتاب ''ارمغان پروفیسر ایمیریٹس اختر الواسع'' (ملی، علمی وانتظامی کارنامے اور فکری جہات) ہے۔ یہ کتاب پروفیسر خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن، علی گڑھ کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ اس کتاب پر پروفیسر عبدالرحیم قدوائی کا پیش لفظ بھی ہے۔ بنیادی طور پر یہ کتاب پروفیسر اختر الواسع کے بارے میں ان کے احباب وتلامذہ کے مضامین اور چند ان کے خود کے منتخب مضامین کا مجموعہ ہے۔

زیر نظر مجموعہ میں علمی شخصیات فاروق ارگلی، ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی، معصوم مرادآبادی، ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی، سہیل انجم، تحسین منور، ڈاکٹر ظفر دارک، فضل الرحمٰن اصلاحی، پروفیسر ابن کنول، رفیق احمد رئیس سلفی، ڈاکٹر نذیر عبدالمجید، ڈاکٹر محمد عزیر ندوی ازہری، ڈاکٹر محمد ایوب اکرم اور محمد عزیر عالم کے مضامین ہیں۔

فہرست بالا سے اندازہ ہوگا کہ اس کتاب کے سبھی مقالہ نگاران اپنے فن کے ماہر اور زبان وادب کے شناور ہیں۔ ان کی تحریریں پختہ اور تحقیقی ہوتی ہیں، اس محفل میں اپنی غیر حاضری پر ہمیشہ ہی افسوس رہا لیکن آج ان سطور کو تحریر کرتے ہوئے یہ افسوس دوچند ہوگیا۔ حالات کا جبر کبھی کبھی وہ نہیں کرنے دیتا جو ہم کرنا چاہتے ہیں۔

کتاب میں شامل سبھی مقالات بہت جامع اور تحقیقی ہیں۔ مقالات کے آغاز سے قبل انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز کی طرف سے پیش کیا گیا سپاس نامہ درج ہے۔ اس میں پروفیسر اختر الواسع کی گوناگوں خدمات کا توصیفی انداز میں تعارف کرایا گیا

ہے۔ باقی مقالات عام طور پر جامع تعارف کی نوعیت کے ہیں۔ ان میں تاثرات کا تاثر بھی جا گزیں ہے۔ خاص طور پر ان کے تلامذہ نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے جیسا ان کی شخصیت کو محسوس کیا اس کے مطابق تعارف کرایا۔ چند مقالات ایسے ہیں جن میں ان کی کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ڈاکٹر نذیر عبدالمجید نے سیرت طیبہ پر ان کی کتاب کا تعارف کرایا ہے اور ڈاکٹر محمد ایوب اکرم پروفیسر اختر الواسع کی مایہ ناز کتاب ''سرسید کی تعلیمی تحریک: ایک مطالعہ'' کا تعارف کرایا ہے۔ ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی نے شنیدہ و دیدہ کے نام ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے، اس کا تعارف کرایا ہے، تحسین منور نے ''کچھ اور چاہیے وسعت'' کا تعارف کرایا ہے، جو پروفیسر اختر الواسع کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔

پروفیسر ابن کنول کا خوب صورت مضمون ان کی سوانحی خاکے کے ساتھ ان کی صلاحیتوں کے اعتراف پر مبنی ہے۔ خاص طور پر پروفیسر اختر الواسع کی جوش خطابت اور اس زور بیاں کے سامنے جامعہ کے وائس چانسلروں کی افتادگی کو بڑے خوب صورت پیرایے میں بیان کیا ہے۔ پروفیسر محمد فہیم اختر ندوی نے اپنے مشاہدات اور مطالعہ کے روشنی میں پروفیسر اختر الواسع کی شخصیت، فکر، عقیدہ، خدمات اور ان کی معنویت کا نہایت اچھے اور جامع انداز میں تعارف کرایا ہے۔

کتاب میں شامل دیگر مضامین خاص طور پر سہیل انجم اور معصوم مرادآبادی کے مضامین اہم ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کتاب پروفیسر اختر الواسع کی شخصیت کا ایک جامع تعارف ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تعارف کا آغاز یا پہلا قدم ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ آگے اس سے بھی بہتر کام سامنے آئیں گے۔ کتاب کے مرتب رفیق احمد رئیس سلفی قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے شاندار اور جامع کتاب مرتب کی۔

(سہ ماہی) اسلام اور عصرِ جدید

کے خاص شمارے

سیرت ومغازی کی اولین کتابیں اور ان کے مؤلفین............۲۰۰روپے

اسلامی تہذیب وتمدن (دورِ جاہلیت سے آغازِ اسلام تک)............۳۰۰روپے

نذرِ علی محمد خسرو............۱۰۰روپے

بیاد خواجہ غلام السیّدین............۱۰۰روپے

بیاد پروفیسر مشیر الحق............۲۰۰روپے

افکارِ ذاکر............۱۵۰روپے

مولانا عبیداللہ سندھی............۲۰۰روپے

ڈاکٹر سید عابد حسین اور نئی روشنی............۲۵۰روپے

مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت............۱۵۰روپے

نذرِ رومی............۲۰۰روپے

قرآن مجید، مستشرقین اور انگریزی تراجم............۱۰۰روپے

پیکر دین ودانش: امام غزالیؒ............۳۰۰روپے

معلمِ عصر: سعید نورسیؒ............۲۰۰روپے

ان کے علاوہ پچھلے عام شمارے بھی ۱۰۰ روپے کی شرح سے دستیاب ہیں۔ اسٹاک محدود ہے۔ پانچ شماروں پر ۱۵ فیصد تجارتی کمیشن بھی دیا جائے گا۔ محصول رجسٹرڈ ڈاک خریدار کے ذمے ہوگا۔

رابطہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵